اردو کا پہلا ناول نگار۔

شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی

از

اویس احمد ادیب - بی - اے - (آنرز)

سنہ ۱۹۳۴ء

بار اول

ہندستانی اکیڈیمی یو۔پی

۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء

ہندستانی اکیڈیمی ہر سال صوبہ متحدہ کی یونیورسٹیوں کے طلباء کو مضامین لکھنے کے لئے مدعو کرتی ہے اور ان طلباء میں جس کا مضمون اکیڈیمی بہتر سمجھتی ہے ان صاحب کو انعام دیتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہمارے صوبہ کے نوجوان اپنی زبان میں تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دیں اور ان کا ادبی ذوق بڑھے۔

اسی سلسلہ میں سنہ ۱۹۳۲ء کے مقابلہ میں مسٹر اویس احمد نے شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے ناولوں پر یہ تنقیدی مقالہ لکھ کر بھیجا تھا۔ اکیڈیمی کے کارکنان نے جتنے مضامین مقابلے کے لئے آئے تھے سب پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اس سال کے مضامین میں مسٹر اویس احمد کا مضمون بہترین ہے اور وہ انعام کے مستحق ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مسٹر اویس احمد نے

ارادہ کیا ہے کہ اس مضمون کو طبع کرا کر ایک مستقل صورت دیں۔ آپ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک ہونہار طالب علم ہیں اور اب اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کی تیاری میں لگے ہیں۔ امید ہے کہ تحصیل علم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ کا ادبی ذوق ترقی کرتا رہے گا اور آپ کامیابی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔

تاراچند
جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈمی
صوبہ متحدہ
الٰہ آباد

فہرست

نشان سلسلہ — صفحہ

غلط نامہ

اس کتاب میں کچھ کتابت اور طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں جن کو کتاب پڑھنے سے قبل براہ کرم یوں درست کر لیجئے

غلط	صفحہ	سطر	صحیح	غلط	صفحہ	سطر	صحیح
نظر	۳	۱۶	نذر	اولہ	۷۲	۴	اور
گئے	۵	۱۲	گئّے	کو	۷۳	۱۶	کا
چنانجہ	۹	۱۶	چناپچہ	کرٹم دھڑم	۷۵	۱۰	کرٹم دھم
کو	۱۱	۱۴	سے	اس کی قدر	۸۲	۱	اس کی کس قدر
کھٹلتے	۱۲	۲	کھٹکتے	ٹھنڈ	۸۶	۴	ٹھنڈی
لو	۱۳	۱۴	کو	اس	۹۲	۸	ان
جس	۴۲	۲	جن	اظّہار	۱۲۰	۸	اظہار
ارو	۴۶	۳	اردو	نو	۱۲۱	۸	توّ
دو	۴۷	۹	وہ	چٹخارین	۱۳۶	۱۲	چٹخارے
لانے	۶۶	۲	لاتے	گی	۱۳۷	۱۰	کی

غلط	صفحہ	سطر	صحیح	غلط	صفحہ	سطر	صحیح
خو	۱۳۸	۳	خود	جیمیں سے یہ	۱۵۸	۱۲	جن میں یہ
نا	۱۴۲	۸	نما	کی	۱۵۹	۱۱	کے
نیں	۱۴۶	۲	سکتیں	ہوسے	۱۶۰	۹	ہیں
ان	۱۴۸	۱۳	اس	ملنا	۱۶۹	۳	ملتا
ٹیکہ	۱۴۸	۱۳	ٹیکا	نہ حکیم	۱۶۹	۷	حکیم
لور	۱۴۹	۴	طور	منصف	۱۶۹	۱۳	مصنّف
لقصان	۱۵۶	۱۶	نقصان	نہیں	۱۷۳	۱۶	نہ
ناول ان	۱۵۸	۳	ناول کے ان	آشنا	۱۷۶	۱۰	آلودہ



اویس احمد ادیب - بی - اے (آنرز)

تمہید

(کسی زبان اور ادب سے اگر ناول نکال دئے جائیں اور پھر اس ادب کے سرمایہ پر نظر ڈالی جائے تو یقیناً اس میں ایک بہت بڑی کمی محسوس ہوگی۔ یہی حال اردو کا بھی ہے یعنی اگر اردو زبان کو ناولوں سے جدا کرکے دیکھا جائے تو وہ ادب کے ایک بہت بڑے جزو سے خالی نظر آئے گی۔ اس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ نہ صرف اردو ادب میں بلکہ ہر زبان میں ناولوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے)۔ ناولوں سے میرا مطلب عام بازاری ناول نہیں جو آج کل حشرات الارض کی طرح بازاروں میں نظر آتے ہیں بلکہ میرا مفہوم صرف اُن ناولوں سے ہے (جو مشہور ناول نگاروں کی مایۂ ناز تصانیف ہیں اور جن کی بدولت اردو ادب

کے ناول اور کسی زبان کے ناولوں سے کسی طرح پیچھے
نہیں رکھے جا سکتے۔ اس زبان کے ناول حسب ذیل پانچ
قسموں میں منقسم کئے گئے ہیں۔

(۱) معاشرتی (۲) تاریخی

(۳) جاسوسی یا پراسرار (۴) ظریفانہ

(۵) مقصدی

(معاشرتی اور تاریخی ناول مولانا عبدالحلیم شرر۔ پنڈت
رتن ناتھ سرشار۔ حکیم محمد علی خاں۔ علامہ راشدالخیری
وغیرہم کے یہاں بکثرت موجود ہیں) ۔ پُر اسرار اور
ظریفانہ ناول مرزا فدا علی خنجر آغا بہار رضوی اور
منشی سجاد حسین (اڈیٹر اودھ پنچ) وغیرہ کی زبردست
تصانیف ہیں۔ رہے مقصدی ناول۔ وہ مولوی نذیر احمد
کے یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔

اب تک انشاءپردازان ادب مولانا نذیر احمد کو
فسانہ نگار لکھتے چلے آئے ہیں اور ان کی تمام تصانیف
کو فسانہ کے نام سے پکارتے ہیں لطف یہ ہے کہ تنقید
کرنے والوں نے بھی اس معاملہ میں تنگ نظری

سے کام لیا ہے۔ ایک نقاد کی تحریر کو دوسرے نے
ہو بہو نقل کر دیا۔ یہی وجہ تھی جس نے مجھے اس
تحقیق کی طرف متوجہ کیا۔ ان کے پڑھنے کے بعد
میں نے یہ محسوس کیا اور تحقیق کرنے کے بعد میں
اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک جماعت ایسے انشاپردازوں
کی ہے جو مولانا کو ناول نگار کہنے کے لئے ہرگز تیار نہیں
کیونکہ ان کے خیال میں مولانا کی تصانیف میں وہ
خصوصیات موجود نہیں ہیں جو ایک اعلیٰ ناول
کے لئے نہایت ضروری ہیں مگر دوسری جماعت
کا یہ خیال ہے کہ مولانا کسی حد تک ناول نگار
کہلانے کے مستحق ہیں اور ان کے ناول مقصدی
ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے ان دونوں کو چھوڑ کر بیچ کا راستہ اختیار
کیا اور مولانا کے کل ناول خود پڑھے اور اُن سے یہ اخذ
کیا کہ مولانا موصوف کے ناولوں میں ایک اعلیٰ ناول
کی خصوصیات کافی تعداد میں موجود ہیں یعنی ان میں
ناول کے عناصر۔ ناول کے منازل اور ناول کے موضوع

خود بخود قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے ایک اعلیٰ ناول نگار کے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ ان تمام تحقیقات سے جو پہلا نتیجہ میں نے اخذ کیا وہ یہ ہے کہ مولانا اردو ادب کے ناول نگاروں میں ایک مایۂ ناز ہستی ہیں۔

عام طور پر تمام اہلِ قلم اس بات پر متفق ہیں کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو ادب کے سب سے پہلے ناول نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔ میں نے مولانا نذیر احمد کو ناول نگار پانے کے بعد اس بات کی تحقیق شروع کی کہ اردو ادب کا سب سے پہلا ناول نگار کون ہے؟ اس کا فیصلہ ان دونوں (مولانا نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار) بزرگ ہستیوں کی کتب کی تصانیف اور طبع ہونے کی تاریخوں پر چھوڑ دیا اور انکی تاریخوں کا موازنہ کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ سب سے پہلا ناول جو اردو ادب میں طبع ہوا وہ مولوی نذیر احمد کا ناول "مراۃ العروس" تھا جو ۱۸۶۹ء

شائع ہوکر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا۔ پنڈت جی کا سب سے پہلا ناول "فسانہ آزاد" ۱۸۸۰ء میں مکمل ناول کی صورت میں پبلک کو ملا۔ اس سے قبل ان کا کوئی ناول طبع نہیں ہوا۔ ان کے طبع ہونے کی تاریخیں باقاعدہ مضمون کے آخری حصے میں جو "نتیجہ" کے عنوان سے ہے، درج کی گئی ہیں۔

میں نے جس وقت اس مضمون کو ہندستانی اکیڈمی کے اس انعامی مقابلے میں روانہ کیا تھا جس پر ۱۹۳۴ء میں مجھے ہندستانی اکیڈمی نے تنلو روپیہ انعام دیا ہے۔ اُس وقت اس کی ظاہری شکل یہی تھی جو سامنے موجود ہے۔ مگر اس وقت میں نے جا بجا اس کی عبارت میں کچھ تبدیلی کر دی ہے۔ کہیں مختصر کیا ہے اور کہیں طول دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کوئی خامی بھی ہو کیونکہ میں نے یہ کتاب اُس وقت لکھی تھی جب میں بی۔ اے (کلاس) کے پہلے سال کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

تمہید ختم کرنے سے قبل میں جناب شاہد احمد صاحب

بی۔اے (آنرز) ایڈیٹر ”ساقی“ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ شاہد صاحب ہی کی بدولت مجھکو مولانا نذیر احمد صاحب کا وہ بلاک ملا ہے جو اس کتاب میں موجود ہے۔

اویس احمد
الہ آباد

۷۸۶

شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی

۱۸۳۶ء لغایت سنہ ۱۹۱۲ء



تاریخ ولادت اور وطن

مولانا نذیر احمد دہلوی خود اپنی ولادت کی صحیح تاریخ سے واقف نہ تھے انھوں نے سرکار انگلشیہ میں جب ڈپٹی کلکٹری کی درخواست بھیجی تھی اُس وقت اپنی تاریخ ولادت ۲۱ ستمبر سنہ ۱۸۳۳ء درج کرائی تھی۔ مگر اُن کی پیدائش کی صحیح تاریخ پنڈت کنجن کے بنائے ہوئے جنم پترہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ جب پنڈت جی نے جنم پترہ بنا کر مولانا کو دکھلایا تو آپ نے اُس کو اپنے

لہ حیات النذیر

بڑے بھائی "مولوی علی احمد صاحب" کے پاس تصدیق کے لئے بھیجا۔ تاریخ صحیح تھی اس لئے مولانا کے برادر بزرگوار نے صاد کیا۔ اس طرح مولانا کی پیدائش کی صحیح تاریخ کا پتہ چلا۔ چنانچہ پنڈت جی کے جنم پتره کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت ۶ ر دسمبر ۱۸۳۶ء ہے۔

آپ کا مقام ولادت موضع رہیڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور ہے۔ مگر وہاں بہت کم عرصہ رہنے پائے کیونکہ آپ کے پدر بزرگوار مولوی سعادت علی صاحب خاندانی تنازعات کی بدولت بجنور چلے آئے تھے اور اکثر وہیں رہا کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ مولانا تحریر کرتے ہیں۔

"بجنور میرا مولد نہیں وطن اقامت نہیں بلکہ وطن اصلی ہے"[1]

دوسرے مقام پر اپنے صاحبزادے کو یوں لکھا ہے۔

"آخر بجنور کا بھی کچھ حق ہے میں وہیں کا کہلاتا ہوں کیونکر کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر لوں"[2]

مگر ایک اور جگہ اشارۃً اور کنایۃً دلی کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں۔

---

[1] [2] حیات النذیر۔

"دہلی[1] والے تو کیوں اپنے تئیں پنجابی سمجھنے لگے پنجابی بھی ان کو پنجابی نہیں سمجھتے اور وہ پنجابی ہیں بھی نہیں اور ہو سکتے بھی نہیں۔ جغرافیے کی رو سے دہلی اور پنجاب کے مواقع مختلف دونوں کے باشندوں کی زبان مختلف۔ وضع مختلف۔ خیر تو غرض یہ ہے کہ میں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں اور اس بات کو میں اس غرض سے ظاہر نہیں کرتا کہ خدا نخواستہ میں پنجاب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں نہیں۔ بلکہ ہر شخص کو اپنا وطن عزیز ہے مجھکو بھی وطن کے ساتھ اُنس ہے اور ہونا چاہئے۔"

ابتدائی تعلیم

سید افتخار عالم بلگرامی تحریر کرتے ہیں:۔

"اُنھوں نے اساتذۂ مستعد سے بالغ استعداد اور پوری قوت مطالعہ کے ساتھ طالب علمانہ طور پر بڑے بحث مباحثہ سے کتابیں تمام کی تھیں۔"

شروعات تعلیم بغدادی قاعدہ سے ہوئی۔ مولوی سعادت علی صاحب نے قرآن شریف پڑھایا اور کچھ زمانہ طفلی مدرسہ کی نظر ہوا مگر جب آپ کے پدر بزرگوار نے یہ محسوس کیا کہ آپ کا قیمتی وقت

---

[1] حیات النذیر

مدرسہ میں ضائع ہوتا ہے اور آپ کی علمی استعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تو خود گھر پر عربی و فارسی پڑھانا شروع کی۔ نو برس کی عمر میں آپ مولوی نصر اللہ صاحب کے جو اس وقت بجنور کے ڈپٹی کلکٹر تھے سپرد ہوئے اور ان سے "پانچ برس کے عرصے میں نحو عربی میں شرح ملّا تک اور منطق میں تہذیب اور میر قطبی اور فلسفہ میں میبذی تک پڑھائے"۔[1] مولوی موصوف سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا نذیر احمد اپنے والد کے ہمراہ فارغ التحصیل ہونے کے لئے دلّی آئے اور مولوی عبدالخالق صاحب کے، جو اورنگ آبادی مسجد میں تعلیم دیتے تھے شاگرد ہو گئے۔ مولانا نے اس زمانے کی اپنی اور دوسرے طلبہ کی بسر اوقات کی حالت دربار دہلی کی کانفرنس میں یوں بیان کی تھی۔

"اکثر طالب علم باری باری سے دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے اور ان ہی میں ایک میں بھی تھا۔"

اس حالت کو مولانا کے شاگرد مرزا فرحت اللہ بیگ نہایت واضح طور پر مولانا ہی کے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:۔

---

[1] حیات النذیر۔

"پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھبری ہاتھ میں لے گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دے دی۔ کسی نے قیمے کی لگدی ہی رکھدی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں ہی پر ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا۔ مسجد کے پاس ہی عبدالخالق صاحب کا مکان تھا۔ اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں اُنھی کے بیٹے ڈپٹی عبدالحامد ہیں۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کے ہاں میرا قدم رکھنا مشکل تھا۔ اِدھر میں نے دروازہ میں قدم رکھا ادھر اُن کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جب تک سیر ڈیڑھ سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا دیتی خدا جانے کہاں سے محلہ بھر کا مصالحہ اٹھا لاتی تھی پیستے پیستے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے جہاں میں نے ہاتھ روکا اور اُس نے بٹہ انگلیوں پر مارا بخدا جان سی نکل جاتی تھی میں نے مولوی صاحب سے کئی دفعہ شکایت بھی کی مگر اُنھوں نے ٹالدیا۔ خبر نہیں مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا بہر حال مارا دھاڑی روز وہاں

جانا پڑتا اور روز یہی مصیبت جھیلنی پڑتی"

"اردو جولائی ۱۹۲۷ء"

مولوی عبدالخالق صاحب کے گھر کا کام کرتے کرتے مولانا پریشان ہو کر ایک روز دہلی کالج کی طرف جا نکلے جہاں طلبہ کو انعامات تقسیم کئے جا رہے تھے۔ آپ بھی تماشائیوں میں شریک ہو کر وہاں گئے اور بھیڑ بھاڑ میں چوٹ کھا گئے۔ کالج کے پرنسپل نے جو دیکھا تو آپ کو ازراہ ہمدردی اُٹھا لیا اور نہایت شفقت سے یہ سوال کیا، کیا پڑھتے ہو؟ آپ نے جواب دیا 'شرح ملا اور ابوالفضل پڑھتا ہوں'۔ اِسکے بعد مفتی صدرالدین خاں صاحب نے مولانا کا شرح ملا میں امتحان لیا۔ آپ امتحان میں پورے اُترے۔ پرنسپل بہت خوش ہوا اور کالج میں داخل کرلیا۔ ساتھ ہی ساتھ چار روپیہ ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا اس طرح آپ ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ طالبعلمی کے زمانے میں آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا اور تمام گھر کا بوجھ آپ کے سر پر آپڑا اس وقت مولانا کو اپنی آیندہ زندگی کا احساس ہوا اور آپ تعلیم کی طرف پہلے سے زیادہ مائل ہو گئے چنانچہ علم ادب۔ علم معانی۔ علم فرائض اور ریاضی پر بہت جلد عبور حاصل کرلیا۔ شروع میں آپ تاریخ و جغرافیہ سے بہت گھبراتے تھے مگر چونکہ وظیفہ ملتا تھا اور اس کو

جاری رکھنا تھا۔ مجبوراً دل لگانا پڑا اس زمانے کی تعلیم سے آپ نے جو کچھ حاصل کیا اس کو یوں قلمبند کرتے ہیں۔

"معلومات[1] کی وسعت۔ رائے کی آزادی۔ تاکر بیشن (درگزر) گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی۔ اجتہاد۔ علی بصیرۃ۔ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں۔ ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال متعصب۔ اکھل کھرا۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ۔ دوسروں کے عیوب کا متجسس۔ برخود غلط .... مسلمانوں کا نادان دوست۔ تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا ...."

مولانا مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب سے اپنی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ زمانے کی تعلیم پر یہ رائے قائم کرتے ہیں۔

"ارے بھئی ایک ہی مضمون کی تکمیل کرنا دشوار ہے آج کل پڑھاتے نہیں۔ لادتے ہیں آج پڑھا کل بھولے۔ تمھاری تعلیم ایسی دیوار ہے جس میں گارے کا بھی ردا

---

[1] حیات النذیر۔

ہے ٹھیکریاں بھی گھسیڑ دی گئی ہیں مٹی بھی ہے ۔ پتھر بھی ہے ۔
کہیں کہیں چونا اور اینٹ بھی ہے ایک دھکا دیا اور اڑا اڑا
دھم گری "

"رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء"

غرض مولانا دہلی کالج میں ۱۸۴۵ء میں داخل ہوئے اور ۱۸۵۴ء تک رہے
اسکے بعد عالم کاروبار میں قدم رکھا ۔

مولانا کا نکاح اور نکاح ثانی جب مولانا نذیر احمد اورنگ آبادی مسجد میں مولوی عبدالخالق صاحب
سے تعلیم پاتے تھے تو ان کے گھر کا کام کاج بھی کیا کرتے تھے ۔ مولوی
موصوف کے ایک صاحبزادے تھے جن کے ایک صاحبزادی تھیں
مولانا اس کو بھی کھلاتے تھے اور کندھے پر لادے لادے پھرا
کرتے تھے بعد کو اسی لڑکی سے آپ کی شادی ہوئی "اور گیارہ ہزار
کا مہر باندھا گیا"[1] آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو ہی چکا تھا جب
یہ خبر آپ کی والدہ کو بجنور پہنچی تو وہ یوں نوحہ گر ہوئیں ۔

"نذیر احمد ہیرا میرے پیٹ میں پڑا تھا مگر اس سے
مجھے کیا لینا میں نے اسکی یا اس کی اولاد کی کیا بہار دیکھی

---

[1] حیات النذیر ۔

میری کمائی دلیؔ والوں نے لوٹ لی اس سے بہتر تھا کہ
بجائے اس ہیرے کے میرے پیٹ میں پتھر پڑتا مگر میری
آنکھوں کے سامنے رہتا۔"

مولانا کی والدہ کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی شادی بجنور میں کسی
رشتہ دار کی لڑکی سے ہوتی اور واقعی یہ خواہش بالکل فطری تھی۔
والدہ کے اصرار سے آپ نے خاندان کی ایک عورت سے نکاح ثانی
کرلیا تھا مگر پورے دو برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ طلاق دینے
پر مجبور ہوگئے۔ کیونکہ مولانا کو دیہات کی عورتوں کا پھوہڑپن۔ بدسلیقگی
اور علم سے بے بہرہ ہونا پسند نہ تھا اور اُن کی زبان کی کرختگی گوارا
نہ تھی۔ کیونکہ دلیؔ جیسے شہر کے تکلفات مولانا کے اوپر اپنا پورا پورا
اثر کرچکے تھے۔

دورِ ملازمت اور علمی مشاغل مولانا کی ملازمت کا زمانہ اُس وقت سے شروع ہوتا ہے
جب کہ وہ دہلی کالج میں ایک وظیفہ خوار طالب علم کی حیثیت سے داخل
ہوئے تھے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔

"مجھکو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے[۱]

---

[۱] حیات النذیر۔

جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور نہ صرف میں نے
بلکہ ہمارے سارے خاندان نے اُس کو سلسلۂ ملازمت
کا آغاز سمجھا۔"

آپ ۱۸۵۴ء میں کالج کی تعلیم پاکر ملازمت کے متلاشی ہوئے اور
اسی سال کنجاہ ضلع گجرات میں چالیس ۴۰ روپیہ ماہوار پر مدرس مقرر
ہوگئے کچھ عرصہ بعد اس ملازمت کو ترک کرکے کانپور چلے آئے اور
ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے مگر وہاں فلر صاحب انسپکٹر مدارس سے
بگاڑ ہوگیا اور آپ استعفا دے کر دلی واپس آئے۔ اسی زمانہ
میں ۱۸۵۷ء کا غدر بھی شروع ہوگیا جس میں مولانا نے ایک انگریز
لیڈی کی جان بچائی تھی غدر کے رفع ہوتے ہی وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس
کے عہدہ پر الٰہ آباد میں مامور ہوئے۔ یہاں منشی عبداللہ خاں صاحب
امین عدالت کے یہاں مقیم ہوگئے جو انگریزی بخوبی جانتے تھے ان ہی
کے رجوع کرنے پر مولانا نے انگریزی پڑھنا شروع کی اور بہت
جلد لیاقت اور قابلیت پیدا کرلی آپ نے انگریزی پڑھنے کے
متعلق خود ایک لکچر میں ارشاد فرمایا ہے۔

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دہلی کالج کے پرنسپل نے
ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں۔ والد مرحوم نے جو ایک

غریب آدمی تھے مگر اپنے وقت کے بڑے دیندار صاف کہدیا کہ مجھے اس کا مرجانا منظور۔ اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں ۔"

۱۸۶۱ء میں آپ کانپور تحصیلدار ہوکر آئے اور دوسال بعد یعنی ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر پہنچ گئے بعد ازاں آپ کی تبدیلیاں ضلع جالون ۔ گورکھپور اور اعظم گڈھ وغیرہ ہوتی رہیں ۔

بابو شیو پرشاد اور مولانا نے مل کر قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ کیا تھا اس کے علاوہ ضابطہ فوجداری اور تعزیرات ہند وغیرہ کے ترجمے بھی آپ ہی کے قلم سے ہوئے تھے۔

۱۸۷۷ء میں آپ مولوی سیدحسن صاحب بلگرامی ۔ نواب محسن الملک اور سر سید مرحوم کے اصرار پر حیدر آباد تشریف لے گئے وہاں تنخواہ کی ابتدا ساڑھے آٹھ سو روپیہ ماہوار سے ہوئی جو بڑھتے بڑھتے سترہ سو روپیہ تک پہنچ گئی تھی ۔ سرسالار جنگ نے مولانا کو نظام (سابق) کی تعلیم کے لئے ایک نصاب مرتب کرنے کے لئے کہا ۔ چنانچہ مولانا نے اس کو لکھا مگر چند وجوہ کی بدولت وہ طبع نہ ہوسکا اب تک آپ حافظ قرآن نہ تھے چھ ۶ ماہ کی کامل جانفشانی کے بعد آپ حافظ بھی ہوگئے لائق علی خاں جو مولانا کے شاگرد تھے

جب سرسالار جنگ ثانی ہوئے تو مولانا کی طرف سے ہر وقت کھٹکتے رہتے تھے کہ کہیں اُستاد ہونے کا بیجا فائدہ نہ اٹھائیں خود نوجوان تھے اس لئے حوالی وحواشی بھی ویسے ہی تھے جو مزاج میں زیادہ دخل رکھتے تھے ان کے منہ لگے مصاحب نے مولانا کی بُرائی کرنا شروع کر دی تھی۔ جب مولانا کو سرسالار جنگ کا رُخ بدلا ہوا معلوم ہوا فوراً پنشن لے کر دہلی واپس چلے آئے۔

تصانیف مولانا نے جو یادگار ہمارے لئے چھوڑی ہے وہ اُن کی حسب ذیل تصانیف ہیں۔

(۱) مرأۃ العروس جو ۱۸۶۹ء میں طبع ہوئی (۲) بنات النعش جس کو مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ کہنا بجا ہے ۱۸۷۲ء میں تصنیف ہوئی (۳) توبۃ النصوح (۴) محصنات جو ۱۸۸۵ء میں طبع ہوئی (۵) (۵) ابن الوقت ۱۸۸۸ء میں تصنیف ہوئی (۶) الحقوق والفرائض (۷) رویائے صادقہ (۸) اجتہاد (۹) امہات الامہ (۱۰) ایامیٰ (۱۱) مبادی الحکمت (۱۲) سمٰوٰت (۱۳) موعظہ حسنہ (۱۴) چند پند (۱۵) رسم الخط وغیرہ وغیرہ ان کی چند تصانیف ایسی بھی ہیں جو طبع نہ ہوسکیں۔ ان کے علاوہ مولانا کا سب سے بڑا کام قرآن مجید کا ترجمہ ہے جس نے آپ کی شہرت میں چار چاند

اور لگا دئے ہیں

خطابات یوں تو مولانا کی کتابوں کی جو قدر گورنمنٹ نے کی وہ انعامات اور انکی یکمشت خریداری سے ظاہر ہے مگر دراصل حکومت وقت نے اپنی قدردانی کا ثبوت مولانا کو ۲۲ جنوری ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا کرکے دیا۔ مولانا نے انگلینڈ سر ولیم میور کو جو لفٹنٹ گورنر رہ چکے تھے قرآن مجید کا ترجمہ بھیجا جس پر ان کو ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا کی یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔ اور ۱۹۱۰ء میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر نے بھی ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری سے سرفراز کیا۔

وفات مولانا جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو ہاضمہ کی شکایت سے بیماری کی ابتدا ہوئی۔ نہ بھوک لگتی تھی اور نہ غذا ہضم ہوتی تھی۔ کمزور ہوتے گئے اور باہر کا آنا جانا مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ ضعف بصارت کی بھی شکایت تھی مگر اب اس کا علاج نہ کرتے تھے جب آپ کے اعزا اصرار کرتے تو اُن کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کرتے۔

"تم کیا دوا دارو کرتے ہو۔ یہ عمارت کہنہ ہو گئی ہے جا بجا سے گر گئی ہے بھلا کہیں ایسے پرانے گھر اڑواڑ

لگانے سے رُک سکتے ہیں ایک دن خود بخود بیٹھ جائیگی"
غرض دن بدن ضعف ترقی کرتا گیا اور ۲۸ اپریل ۱۹۱۲ء کو
داہنی جانب فالج گرا اور ۳ مئی یوم جمعہ ۱۹۲۲ء کو رحلت
کی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

مولانا کا حلیہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب آپ کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں۔

وہ رنگ سانولا مگر روکھا - قد خاصہ اونچا تھا مگر چوڑان
نے لمبان کو دبا دیا تھا - دہرا بدن - گدرا نہیں بلکہ
موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل فرماتے تھے کہ بچپن میں
ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑ دینے سے بدن
جس طرح مُرمُردوں کا تھیلا ہو جاتا ہے - بس یہی کیفیت
تھی - بھاری بدن کی وجہ سے چونکہ قد ٹھنگنا معلوم
ہونے لگا تھا اس لئے اس کا تکملہ اونچی ترکی ٹوپی
سے کر دیا جاتا تھا - کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا -
توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا
بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا اور
محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا گرمیوں میں

تہمد (تہ بند) باندھتے تھے۔ اس کے پلّو اُڑسنے کے بجائے
ادھر اُدھر ڈال لیتے تھے .... سر بہت بڑا تھا مگر
بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے
اختیار میں رکھا تھا جو تھوڑے رہے سہے بال تھے وہ
اکثر نہایت احتیاط سے صاف کرا دئے جاتے تھے ...
...... آنکھیں چھوٹی چھوٹی ذرا اندر کو دھنسی ہوئی
تھیں۔ بھویں گھنی اور آنکھوں کے اوپر سایہ افگن تھیں
آنکھوں میں غضب کی چمک تھی کلہ جبڑا بڑا زبردست
پایا تھا .... ناک کسی قدر چھوٹی تھی اور نتھنے
بھاری .... گو متانت چھو کر بھی نہیں گئی تھی
لیکن جسم کے بوجھ نے رفتار میں خود بخود پیدا کر دی تھی
ڈاڑھی بہت چھدری تھی .... گردن چھوٹی مگر
موٹی تھی"

رسالہ اُردو جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

مولانا کے حلیہ میں جو حصہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب
نظر انداز کر گئے ہیں اس کو ہم یہاں حیات النذیر سے لے کر
درج کرتے ہیں۔

"بلند اور چوڑی پیشانی ...... ہونٹ پتلے دہانہ متوسط
دانت ہموار اور سفید تھے .... سینہ بہت چوڑا
بالوں سے صاف .... مونچھیں بڑی اور بھری
ہوئیں .... ہاتھ اور پاؤں دونوں بھرے بھرے
ہیں ہتھیلیاں چوڑی چوڑی اور پنجے زبردست ہیں پاؤں
کا پنجہ بھی چوڑا ہے پیٹھ بھی چوڑی ہے"

شوق تجارت مولانا کی طبیعت تجارت کی طرف بہت مائل تھی اور ان کی یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کی عام توجہ تجارت کی طرف ہو اسی پہلو کو مدنظر رکھ کر آپ مسلمانوں کو تجارت کے لئے روپیہ پیسہ سے مدد کرتے تھے یہ ضرور ہے کہ وہ جس شخص کو روپیہ دیتے تھے اس سے کوڑی کوڑی کا حساب لے لیا کرتے تھے گو کہ مولانا حافظ اور عالم ہونے کے علاوہ بڑے تجربہ کار تھے مگر اس راہ میں ایک ناتجربہ کار لڑکے سے زیادہ نہ تھے سینکڑوں روپیہ برباد بھی کیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب سے مولانا نے جو کچھ اس کے متعلق فرمایا ہے ملاحظہ ہو۔

"میاں میں سچ کہتا ہوں کہ اس تجارت کے شوق

بس تین لاکھ روپیہ کھو بیٹھا ہوں پھر بھی جو کچھ مجھے بعض کھرے دوکانداروں
سے فائدہ پہنچا ہے اُس نے میرے نقصان کی تلافی ہی
نہیں کردی بلکہ کچھ نفع ہی پہنچا دیا ہے بیٹا! تم بھی تجارت
کرو روپیہ میں دیتا ہوں نوکری کی کھکھیڑ اٹھاؤ گے تو مزا
معلوم ہوگا۔"

رسالہ اُردو۔ جولائی ۱۹۲۷ء

یہ تھا مولانا کا شوق تجارت۔ یار دوستوں نے شروع شروع
میں فرضی نفع کی طمع دلائی تھی جو بعد کو دراصل ایک خواہش کی
صورت میں تبدیل ہوگئی تھی جو شخص روپیہ مانگنے آتا فوراً اسکا
اعتبار کرکے روپیہ حوالے کردیتے بعض لوگ تو ان کے اس قدر
منہ لگے ہوئے تھے کہ اُن کی بات کے آگے وہ اپنی اولاد کی باتوں
کا بھی خیال نہ کرتے تھے۔

سود اور مولانا کے خیالات

آپ اور مولویوں کی طرح نہ تھے۔ سود لینا جائز سمجھتے
تھے ان پر کوئی اعتراض بھی نہ کرتا تھا کیونکہ ایک تو مولوی دوسرے
حافظ۔ عام لوگوں سے ایک روپیہ سیکڑہ سود لیتے تھے اپنے شاگردوں
سے بھی رعایت نہ کرتے تھے اگر بہت مہربان ہوئے تو چودہ آنہ

سیکڑہ سود لے لیا۔

خصائل وعادات

مولانا کی عادت میں یہ داخل ہوگیا تھا کہ وہ اپنی ضعیفی کے عالم میں بھی خود کو ایک طالبعلم تصور کرتے تھے اور "آپ کا انتقال سے چار سال قبل سنسکرت پڑھنا" اس کی زندہ مثال ہے۔ عربی اور فارسی کے تو آپ ماہر تھے ہی انگریزی پر بھی فوقیت حاصل کرلی تھی تلنگی زبان بھی جانتے تھے اردو زبان پر عالمانہ قدرت رکھتے تھے۔ ہندی کو بھی اپنی لونڈی بنانا چاہتے تھے مطلب یہ ہے کہ آخری وقت تک ان کا مطالعہ برابر جاری رہا۔ مگر جب آنکھیں کمزور ہوگئیں تو دوسروں سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے

مولانا کو آخیر عمر میں 'کنجوس' کا خطاب عوام سے ملا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس شخص کو وہ روپیہ دیتے تھے اس سے پیسے پیسے کا حساب لیتے تھے بچپن سے کفایت شعاری سیکھی تھی ۔ روپیہ کا بیجا تصرف آپ کے اصول زندگی کے خلاف تھا

ان کی سادہ مزاجی اور انکساری سب پر عیاں تھی۔ کبھی شوخ اور بھڑکدار لباس پسند نہ کیا ہمیشہ سادہ پوشاک پسند کی گھر میں تہ بند باندھتے تھے اور جب باہر نکلتے تھے پیجامہ پہن لیتے تھے۔

ظرافت بدرجہ اتم موجود تھی۔متانت گو ان میں قدرتی طور پر نہ تھی مگر موٹاپے نے پیدا کر دی تھی۔کبھی انگریزی بال نہ خود رکھے اور نہ اولاد کو رکھنے دئے۔کثیرالاحباب نہ تھے۔مگر جان پہچان والے بہت زیادہ تھے دوستوں سے معمولی معمولی باتوں پر بگڑ جاتے تھے اور جلد صاف نہ ہوتے تھے۔آپ کی مستقل مزاجی قرآن شریف کے ترجمے سے ظاہر ہے جس کو ڈھائی برس کی مکمل رات و دن کی جانفشانی کے بعد پورا کیا تھا جھوٹ کبھی نہ بولتے تھے۔راست بازی سے برابر کام چلاتے تھے تعصب چھو کر بھی نہ گیا تھا۔یتیم بچوں پر خاص طور سے مہربانی کیا کرتے تھے۔گورنمنٹ کے سچے خیر خواہ تھے آپ راہ و رسم کے زیادہ پابند نہ تھے اور اُن مبتذل باتوں اور خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جن سے سماج کو سوائے نقصان کے فائدہ کی قطعی امید نہ تھی۔

15/8/77

مولانا ایک ناول نگار کی حیثیت سے

موجودہ زمانے میں مشکل سے کوئی زبان ایسی ہوگی جو افسانوں اور ناولوں سے خالی ہو بعض میں تو انکی اس قدر بہتات ہے کہ اگر ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو اُس زبان کا ادب مکمل ادب نہیں کہلا سکتا۔ ہر زبان میں اس فن کی ابتدا مختلف اوقات میں ہوئی یعنی کسی میں پہلے اور کسی میں کچھ عرصہ بعد مگر اس بات کا پتہ لگانا کہ سب سے پہلے اس فن کی ابتدا کب۔ کس طرح اور کس زبان میں ہوئی۔ اور کون کون سے مدارج طے کر کے اُس نے یہ شکل اختیار کی ایک بہت دشوار مسئلہ ہے ہاں اگر اس کا کچھ جواب ہو سکتا ہے تو یہی جو رچرڈ برٹن لکھتا ہے۔

> "کہانیاں ساری دنیا کی پیاری ہیں اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ قصہ گوئی کا آغاز اسی وقت سے ہوا ہو جس وقت سے کہ انسان نے کھڑا ہونا سیکھا"

مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ ایسا جواب کسی طرح کافی اور

تسلّی بخش نہیں ہو سکتا۔ کوئی زمانہ تو ایسا ضرور ہوگا جس میں اسکی ابتدا ہوئی ہوگی۔ اب تک اس مسئلہ کے حل کرنے کے لئے تحقیقات جاری ہیں اور اسکا جو نتیجہ اس وقت تک ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ افسانہ نویسی سب سے پہلے مشرق ہی میں شروع ہوئی اس کا رچرڈ برٹن نے بھی ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"اگر انجیل مقدس کی بعض روایات کو جن میں تاریخی واقعات ادبی اور تخیلی نزاکتوں کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں 'قصہ' کہہ سکتے ہیں تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مشرق کے ریگستانوں میں قصہ گوئی اسی وقت باضابطہ شکل اختیار کر چکی تھی جس وقت دنیا ابھی تحریر سے واقف بھی نہیں تھی .... نثریہ روایات جن میں رزم بزم کے واقعات یا مقامی حالات کا ذکر ہوتا تھا۔ نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی چلی آتی اور حافظے کی مدد سے محفوظ کر لی جاتی تھیں۔"

ناول نگاری کی ابتدا کا سہرا بھی مشرق ہی کے سر ہے۔ جاپان میں ناول نگاری دسویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکی تھی۔ چین میں اس کا ظہور سولھویں[16] اور سترھویں[17]

صدی عیسوی میں ہوا۔ یورپ کے کل ادب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی وہاں لوگ تحریر سے واقف نہ تھے بلکہ چاروں طرف جاہلیت کا دور دورہ تھا وہاں بہت عرصہ بعد تحریر ایجاد ہوئی اور مسیحی مذہب کے قوانین و قواعد لکھے گئے مگر ہندوستان میں افسانہ نگاری قدیم زمانے سے تھی اس کو عبدالقادر صاحب "دنیائے افسانہ" میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ہندوستان قدیم زمانہ سے' افسانہ نگاری میں' اپنی آپ نظیر ہے"[1]

رامائن مہابھارت اور شکنتلا۔ تاریخی۔ علمی اور فنی افسانوں میں بہت بڑا رتبہ رکھتی ہیں اردو زبان میں افسانوں کی ابتدا کب ہوئی اور انھوں نے کون کون سی ارتقائی منزلیں طے کیں یہاں مولانا عبدالقادر صاحب کے الفاظ میں درج کی جاتی ہیں۔

"(۱) ۱۰۸۳ سے ۱۲۰۰ تک۔ ۱۰۸۳ کے قریبی زمانے[2] میں ابن نشاطی کا "طوطی نامہ" لکھا گیا۔ اور سودا جنھوں نے میر کے قصے "شعلۂ عشق" کو نثر میں لکھا تھا۔ ان کا

---

[1] [2] از دنیائے افسانہ۔

زمانہ ۱۸۰۰ء کے قریب تک ہے۔

(۲) ۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۶ء تک اس زمانے کی افسانوی پیداوار تمام تر فورٹ ولیم کالج کی کوششوں پر مشتمل ہے۔

(۳) ۱۸۳۶ء سے ۱۸۵۷ء تک۔ اس دور میں افسانے نسبتاً کم لکھے گئے مگر جو لکھے گئے وہ اپنے اسلوب بیان کے تکلفات کی وجہ سے دوسرے دور کے سادہ اسلوب بیان سے ممتاز ہیں۔

(۴) ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک۔ یہ وہ عبوری دور ہے جس میں انگریزی افسانوں کا اثر اردو قصوں پر پڑنے لگتا ہے۔ اور کوششیں کی جاتی ہیں کہ اردو افسانوں کو بھی انگریزی وضع پر ڈھالا جائے۔

(۵) ۱۹۰۰ء سے حال تک۔ جس میں اردو ناول نگاری شروع ہوتی ہے۔"

یہ ہیں وہ ارتقائی منزلیں جو اردو افسانوں اور ناولوں نے طے کیں ہم پہلے ابتدا کے تینوں دور کی مختصر کیفیت بیان کریں گے اور پھر چوتھے دور پر جو دراصل ہمارے اس مختصر مضمون سے تعلق رکھتا ہے ایک تنقیدی نظر ڈالیں گے پانچویں دور میں عہد جدید

کے اردو ناول نگار آتے ہیں جو ہمارے اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

پہلے دور میں وہ نظمیں آتی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی قصہ بیان کیا گیا ہے اس طرح اردو شعراء کی کل قصہ وار مثنویاں اور نظمیں افسانوی ادب کی ایک شاخ ہو جاتی ہیں۔ میر تقی میر کی مثنویاں، "شعلہ عشق" "دریائے عشق" اور "غرقابی عشق" وغیرہ وغیرہ وہ افسانے ہیں جو نظم میں لکھے گئے ہیں یہ افسانے منظوم افسانوں کی پہلی منزل ہے۔ اس دور کے افسانوں کو تین منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی منزل وہ ہے جس کی مثالیں ہم اوپر درج کر آئے ہیں عبوری یا ارتقائی منزل اس کے بعد آتی ہے جس میں مثنوی "خواب وخیال" اور مثنوی "گلزار نسیم" وغیرہ آتی ہیں ان کے علاوہ اور بھی اس دور میں ایسی تصانیف ملیں گی۔ ان کا منتہائے کمال مثنوی "سحر البیان" سے ظاہر ہوتا ہے۔ دکن میں "طوطی نامہ" کے علاوہ بھی چند کتابیں اُس وقت موجود تھیں شمالی ہند میں مرزا رفیع سوداؔ ہیں جنھوں نے افسانہ کو اردو نثر میں لکھ کر ہم سے روشناس کرایا اور میرؔ کے "شعلہ عشق" کو نثر میں لکھا۔

دوسرا دور ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۸۳۶ء تک رہتا ہے اس وقت انگریزوں کا زور زیادہ تر بنگال سے اودھ تک تھا ان کو چونکہ ہندوستانیوں پر حکومت کرنا تھی اور ان سے خلط ملط بڑھانا ایک لازمی امر تھا اس لئے ان کے لئے اردو پڑھنا ایک ایسی ضرورت تھی جس کو کسی طرح نظر انداز کیا ہی نہ جا سکتا تھا۔ یہ ایک ایسی زبان تھی جس کو اُس وقت سب بولتے اور سمجھتے تھے اس لئے ملک کے بڑے بڑے کارپردازان اردو کو مختلف مقامات سے وہاں بلا کر روزمرہ کی زبان میں کتابیں لکھنے کی ترغیب دی اور اس کا نعم البدل دینے کو کہا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان کی کوششوں کی بدولت اردو نے بہت جلد یہ ارتقائی منزلیں طے کر لیں ۔ فورٹ ولیم کالج میں جو مشہور کتابیں ترجمہ کی گئیں یا لکھی گئیں حسب ذیل ہیں ۔

"باغ و بہار ۔ گنج خوبی ۔ گل بکاولی ۔ طوطا کہانی ۔ باغ اردو ۔ شکنتلا ناٹک ۔ قصص مشرقی ۔ آرائش محفل اور نثر بے نظیر وغیرہ ۔"

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں جو ان کے مقابلے میں شہرت حاصل نہ کر سکیں ان کی عبارت صاف اور سلیس ہے ان میں

تصنع تو چھو کر بھی نہیں گیا۔ مگر قدیم مقفّٰی و مسجّع طرز تحریر کا اثر جا بجا نمایاں ہے ان تمام کتابوں میں "باغ و بہار" ایک بیش بہا افسانہ تصور کیا جاتا ہے۔

تیسرے دور کا آغاز ۱۸۳۶ء سے ہوتا ہے اس زمانے میں ایسی کتابیں بہت کم لکھی گئیں جو اپنی خصوصیات کی بدولت انفرادی حیثیت کو قائم رکھیں۔ یہ دور تاریخ کے لحاظ سے بھی ہر دور سے چھوٹا ہے اور ادبی پیداوار کے لحاظ سے بھی سب سے کم ہے اگر اس زمانے کی تصانیف پر ناز کیا جاسکتا ہے تو صرف تین کتابوں پر یعنی "دبستان حکمت" "فسانۂ عجائب" اور "شگوفۂ محبت"۔ ان میں "فسانۂ عجائب" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور اس کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنے طرز بیان میں اسی قدیم اسلوب بیان اور طرز تحریر کو روا رکھا۔ سادگی پر رنگینی کو ترجیح دی۔ اس کتاب میں مقفّٰی و مسجّع عبارت بدرجہ اتم موجود ہے۔ بناوٹ اور تصنع عبارت آرائی کا جزو ہو گئے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اردو زبان نے فروغ حاصل کرنا شروع کیا یہ اس کا عبوری اور چوتھا دور ہے اس زمانہ سے قبل اور اس کے دس برس بعد تک بھی اردو ادب میں

کوئی اور جنل ناول موجود نہ تھا یہ ضرور ہے کہ اس وقت تک کئی انگریزی ناولوں کے ترجمے کئے جا چکے تھے اور ترجمہ کئے ہوئے افسانے بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اب تک اردو زبان انگریزی کے اثر سے محفوظ تھی مگر جوں جوں اُن (انگریز) کے پیر ہندوستان میں مستحکم ہوتے گئے انگریزی زبان کا چرچا دن بدن بڑھتا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانے کے انشا پردازان اردو بھی اس جدید اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کی تصانیف پر وہی اثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی پیداوار جس پر اردو ادب کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد حسین آزاد مولانا شبلی نعمانی، سر سید احمد، نواب محسن الملک، خان بہادر منشی ذکاء اللہ خاں، مولوی نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ہستی ایک خاص کام کے لئے مخصوص ہے مگر دو ہستیاں ایسی ہیں جو ناول نگاری کے لئے مشہور ہیں وہ مولوی نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔

شمس العلماء مولوی نذیر احمد ایل ایل۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ ایل سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کے مشہور اور باکمال انشا پردازوں کو ناول نگاری کا وہ راستہ بتلایا

جس سے اُردو داں اُسوقت تک بے بہرہ تھے ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی طبیعت بذات خود اس طرف مائل نہ تھی بلکہ جب انھوں نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے عمدہ اور دلچسپ کتابیں تلاش کیں اور جستجو کے بعد بھی نہ پائیں تو وہ ایسی کتابیں لکھنے پر مجبور ہوگئے جو ناول کے پیرایہ میں ہوں جن میں دلچسپی کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو جو پند اور نصیحت کا سرچشمہ ہوں اور جو انسان کی روزانہ زندگی میں راہبری کا کام دیں ۔ واقعات وہ ہوں جو انسان کو دن رات اُٹھتے بیٹھتے پیش آتے ہوں اس کے علاوہ اگر اُن پر عمل کیا جائے تو وہ در اصل انسان بنا دیں۔ اگر اُن کو ایسا اتفاق پیش نہ آتا تو شاید آج ادب اردو اُن کے نام سے بے بہرہ ہوتا۔

فی زمانہ اردو انشا پردازوں کی دو جماعتیں ہیں ۔ ایک جماعت یہ رائے رکھتی ہے کہ اردو زبان میں سب سے پہلے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں کیونکہ اُن کے افسانوں میں موجودہ زمانے کے ناولوں کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہیں مگر دوسری جماعت کو اس سے اختلاف ہے وہ کہتی ہے کہ نذیر احمد کی وہ ہستی ہے جو اردو ادب کے سب سے پہلے ناول نگار

کہلانے کے قابل ہے کیونکہ ان کے ناولوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو موجودہ اعلیٰ ناولوں کا معیار ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ناول نگاری میں کئی نئی باتوں کے موجد بھی ہیں۔ پہلے ہم ان دونوں جماعتوں کی رائیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں یہاں درج کرتے ہیں اس کے بعد ہم خود مولانا نذیر احمد اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں گے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ سب سے پہلا ناول نگار کہلانے کا مستحق کون ہے اور سب سے پہلے کس کا ناول طبع ہوا۔

مولانا عبدالقادر صاحب "دنیائے افسانہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"حافظ نذیر احمد کے افسانوں کو ہم درمیانی زمانہ میں اس لئے رکھتے ہیں کہ جس طرز میں یہ قصے لکھے گئے تھے وہ قدیم افسانوں کی طرز ہے نہ کہ ناول کی"۔

مولانا عبدالقادر صاحب کو اپنی رائے کا اختیار ہے کہ جس کو جو چاہیں لکھیں مگر یہ لکھنا کہ ان کے ناول 'قصہ' ہیں ایک ایسی بات ہے جو اعتدال کو چھوڑ کر زیادتی کی طرف مائل ہے آپ نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جناب عبداللطیف صاحب

مصنف "دی انفلوئنس آف انگلش لٹریچر آن اردو لٹریچر" کے خیال کو ہوبہو "دنیائے افسانہ" میں درج کرکے اس کو تسلیم کرلیا کہ اردو کے سب سے پہلے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

"اردو میں سب سے پہلی کوشش جس میں موجودہ ناول کی جھلک پائی جاتی ہے وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانہ آزاد" ہے جو "اودھ اخبار" میں ایک سال تک بالاقساط شایع ہوتا رہا۔"

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اردو ادب میں سرشار کے "فسانہ آزاد" سے پہلے کوئی ایسی کتاب طبع نہیں ہوئی تھی جو ناول کہلانے کے علاوہ موجودہ ناول کی خصوصیات بھی اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہو اس بیان کے لکھنے کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں اول یہ کہ مولانا عبدالقادر صاحب نے اس کو بغیر کسی کوشش اور چھان بین کے تسلیم کر لیا یا پھر ان کو مولانا نذیر احمد کے ناولوں میں ایک اعلی ناول کی خصوصیات نہ ملی ہوں گی۔

سے) یہ اُن انشاءپردازان ادب کی رائیں ہیں جو مولانا نذیر احمد

کو ناول نگار کہنے کے لئے تیار ہیں۔ "سید غلام محی الدین صاحب"
" اردو کے اسالیب بیان" میں یوں تحریر کرتے ہیں۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ (نذیر احمد) فطرت
کی طرف سے ناول نگاری کے لئے پیدا کئے گئے تھے"
دوسری جگہ اسی کتاب میں یوں تحریر کرتے ہیں۔
"ان کے ناول اُردو کے لئے مایۂ ناز ہیں"
جامع حیات النذیر لکھتے ہیں۔
"مولانا نے وہاں ایک تو "توبتہ النصوح"
لکھی جو ان کے ناولوں میں سب سے زیادہ مقبول
ناول ہے"
دوسرے مقام پر "ایامیٰ" کے ناول ہونے کا بھی ان
الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔
"مولانا نے بھی اس ناول میں ضرورت عقد
بیوگان کو ایک دلچسپ ناول کے پیرائے میں بہت
عمدگی سے بیان فرمایا ہے"
(جناب رام بابو سکسینہ صاحب نے بھی "تاریخ ادب اردو"
میں جہاں مولوی نذیر احمد کی تصانیف کا ذکر کیا ہے تو انکی

چند کتابوں کو مثلاً "مرأۃ العروس" "توبۃ النصوح" "ابن الوقت" "محصنات" "ایامیٰ" "رویائے صادقہ" "منتخب الحکایات" وغیرہ کو "از قسم ناول و حکایات" لکھا ہے اس کے علاوہ دوسرے موقع پر "اخلاقی ناول" کے عنوان سے مولانا کی کتب مذکورہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"سب سے پہلی کتاب جس سے مولانا کی شہرت کو ترقی ہوئی ان کا ناول "مرأۃ العروس" ہے۔"

توبۃ النصوح کے متعلق آگے چل کر یوں لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد توبۃ النصوح کا نمبر ہے جو مولانا کا سب سے بہترین ناول سمجھا جاتا ہے۔"

اسی کتاب میں جو باب "اردو ناول کی ابتدا" کے عنوان سے ہے۔ مصنف نے "افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"البتہ مولوی نذیر احمد صاحب کے بعض قصے موجودہ ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں گو کہ ان میں بھی موجودہ اصول ناول نویسی کی پیروی نہیں پائی جاتی۔"

کسی شخص کی کتاب کو قصّہ یا ناول کہہ دینا کوئی دشوار بات نہیں۔ یہ محض ذاتی رائے پر منحصر ہوتا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ تنقید کرنے والوں نے بھی ایک دوسرے کی ایسی کورانہ تقلید اس معاملہ میں کی ہے جس کا دھبّہ اردو ادب کے لئے باعث ذلت ہے۔ اب ہم مولانا نذیر احمد کے ناولوں کے موضوع کو دیکھیں گے۔ اس کے بعد ان کے ناولوں کے **عناصر اور منازل** تلاش کریں گے اور اس پر غور کریں گے کہ کہاں تک انھوں نے ایک ناول نگار کے فرائض کو انجام دیا ہے اور ان کے ناول کس حد تک 'ایک اعلیٰ ناول کی خصوصیات' رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان میں کچھ غلطیاں یا خامیاں موجود ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اُن کی وجہ سے ناول نگاروں کی فہرست سے بالکل علیحدہ کر دئے جائیں اردو ادب کے مایۂ ناز ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر صاحب بھی ان خامیوں سے محفوظ نہ رہ سکے چہ جائیکہ ایک موجود۔

مولانا نذیر احمد کے ناولوں کا موضوع

سب سے پہلی بات جو ایک ناول میں دیکھی جاتی ہے وہ اس کا موضوع ہے جس کو

والٹر بیسنٹ یوں لکھتا ہے۔

"ناول کے موضوع کی وسعت خود ذات انسانی
سے کسی طرح کم نہیں۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں
کا گہری نظروں سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا تعلق
ان کے افعال، ان کے خیالات اغلاط اور خامکاریوں
ان کی عظمت اور ان کی فرومائگی سے ہے بے شمار
حسین اشکال ان کی متلون مزاجی، خوف۔ احساسات
جوش اور جذبات جو قلب انسانی میں تموج برپا رکھتے
ہیں یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کا
موضوع خود انسان ہے۔"

اس کے علاوہ دنیا کی ہر چیز ناول کا موضوع ہو سکتی ہے
خواہ وہ چیز اچھی ہو یا بری۔ مگر یہ ناول نگار پر منحصر ہے کہ وہ ایک نہایت
عمدہ چیز کو ذلیل اور ناکارہ کر کے اپنے ناول میں دکھلا دے
اور ایک نہایت حقیر چیز کو اعلیٰ درجہ دے۔ کبھی کبھی یہ بھی
ہوتا ہے کہ ناول کا موضوع بذاتِ خود کوئی صفت نہیں رکھتا
اس وقت یہ ناول نگار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس کو اچھا یا

لے دنیائے افسانہ۔

بڑا بنا دے اس سے ناول نگار کا فطری رجحان ظاہر ہوتا ہے انسانی سوسائٹی ہی کو لے لیجئے اسمیں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں بعض اوقات ناول نگار ایک شریف انسان کو اپنے ناول کا موضوع قرار دیتا ہے اور پہلے اس میں وہ وہ خوبیاں پیدا کرتا ہے جو اگر ڈھونڈی جائیں تو شاید ایک فرشتہ میں بھی نہ ملیں اور بعد ازاں اس کو ذلیل و خوار، بُری اور کمینی عادتیں پیدا کر کے دکھلاتا ہے اور ایسے ہی اس کے برعکس بھی کرتا ہے۔

(مولانا نذیر احمد کے ناول اس معیار پر پورے اُترتے ہیں کیونکہ ان سب میں انسان ہی کا ذکر ہے۔ ان سے پہلے "فسانۂ عجائب" اور معدودے چند ہی ایسے افسانے ہیں جنمیں انسان موضوع قصّہ ہے اگر ان کے مواد پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی دیو اور پری کے ذکر سے خالی نہیں انمیں جا بجا جادو اور طلسم نظر آتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو طلسم و سحر۔ پری اور دیو کو چھوڑ کر انسان کی طرف رجوع ہوئے ہیں انھوں نے اپنے ناولوں میں صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ زندگی کے ایک حصّہ پر روشنی ڈالی اور دوسرے

کو غائب کر دیا بلکہ دونوں پہلوؤں پر بخوبی خامہ فرسائی کی ہے۔
یعنی کسی میں نیک مردوں اور عورتوں کو لیا ہے۔ اور کسی میں بد۔
بیہودہ اور مکار لوگوں کا خاکہ اُڑایا ہے۔ مردوں کو چھوڑ کر اگر
مستورات کو دیکھا جائے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دراصل
مولانا کا بہت بڑا احسان عالم نسواں پر ہے اور رہے گا۔
"مراۃ العروس" کو لے لیجئے اس کا موضوع بھی "انسان" ہے۔
اس میں دو لڑکیوں کو لیا ہے ایک کو نیک خصلت اور دوسری
کو بدمزاج دکھلایا ہے۔ اس کو یوں شروع کرتے ہیں۔

"جو آدمی دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا اس
سے زیادہ کوئی بیوقوف نہیں ہے اور غور کرنے کے
واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں ہیں لیکن سب
سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے۔ غور کرنا چاہیئے
کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے زندگی میں مرنے
تک اُس کو کیا کیا باتیں پیش آتی ہیں اور کیونکر اس
کی حالت بدلا کرتی ہے۔"

اس کے علاوہ ان کے ناولوں کو دیکھیئے جن میں بھولے
ہوئے مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ دوسرے مذہب والوں کو بھی

مذہب کی طرف رجوع ہونے کی تلقین کی ہے۔ بگڑے ہوئے
لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے اور بھولے ہوئے
انسانوں کو ان کا فرض یاد دلایا ہے۔ تربیت اولاد کے طریقوں
پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے "توبۃ النصوح" کے دراصل لکھنے کا
مقصد ہی یہ تھا۔ اس کو مولانا خود لکھتے ہیں۔

"اس کتاب میں انسان کے اُس فرض کا مذکور
ہے جو تربیت اولاد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب
کے تصنیف کرنے سے مقصود اصلی یہ ہے کہ اس
فرض کے بارے میں جو غلط فہمی عموماً لوگوں سے واقع
ہو رہی ہے اس کی اصلاح ہو۔"

غرض یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ ناول میں انسان کو اپنا
موضوع قرار دیتے ہیں۔ وہ انسان کیسا ہوتا ہے؟ وہ نہیں
جس کو اگر دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈا جائے تو شاید کہیں
پتہ نہ ملے بلکہ یہ لوگ وہی ہیں جو ہم سے روزانہ ملتے جلتے
ہیں۔ اس سے ہم کو یا کسی انشا پرداز کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مولانا
عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کا موضوع بھی
انسان ہی ہیں مگر پھر بھی اسکی ابتدا کا سہرا مولوی نذیر احمد ہی کے

سر رہتا ہے کیونکہ شرر اور سرشار نے بعض اوقات اپنے ناولوں کا موضوع ایک ایسے انسان کو بنایا ہے جس کو چراغ لیکر کیا تیز سے تیز روشنی دینے والی چیز کو لے کر ڈھونڈا جائے تو کہیں پتہ نہ ملے گا۔ مولانا نذیر احمد اس کے موجد ہوتے ہوئے اس قدر کامیاب ہوئے ہیں کہ غالباً اس کے قبول کرنے میں کسی کو انکار نہ ہوگا اور یہ اُس وقت جب کہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ انسان کی زندگی کے روزانہ واقعات کی اہمیت کیا ہے؟ جس کو "دلگداز" ۱۹۰۷ء تک بھی نہ پہچان سکا کہ انسان کا روزانہ زندگی کے واقعات سے کیا تعلق ہے؟ اس کی اور جانور کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"پیدا ہونا۔ کھیل کود کے بڑا ہونا۔ کچھ دنوں استاد کے سامنے بیٹھ کے محض بے نتیجہ اپنا اور اس کا بھیجا خالی کرنا۔ شادی کرنا نہیں بلکہ دوسروں کے ہاتھوں شادی کا ہو جانا اور چند دنوں تک روٹی کی فکر میں مبتلا رہ کے اور زمانہ کی سختی و سستی برداشت کر کے مرجانا ہماری موجودہ زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس میں اور ایک جانور کی زندگی میں بہت ہی تھوڑا فرق ہے۔"
دلگداز جنوری ۱۹۰۷ء

مولانا شررؔ کے ناولوں کی طرح جو برابر دلگداز میں شایع ہوتے رہے انھوں نے غیر قوم کے لوگوں کو اپنے ناولوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ اپنی سوسائٹی میں سے ایک فرد کی زندگی کو لیا ہے اور اس کو حد درجہ کامیاب دکھلایا ہے ۔ شررؔ نے اپنے ناولوں میں زیادہ تر پچھلے زمانہ کے انسانوں کو موضوع قرار دیا ہے جو زیادہ تر غیر ملکی ہیں ۔ ہم کو اس سے انکار نہیں کہ مولانا شررؔ نے ہندوستانیوں کو بھی اپنے بعض ناولوں کا موضوع بنایا ہے مگر ان کے یہ ناول زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ۔

سرشارؔ اور علامہ راشد الخیری نے بھی انسان کو اپنے ناولوں کا موضوع قرار دیا ہے ۔ جہاں کہیں وہ جذبات نگاری کرتے ہیں ۔ تو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور اس سے ہمدردی کو بطور خراج وصول کرتے ہیں ۔ مولانا نذیر احمد اس میں بھی اُن سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں ۔ کیا انسانی ہمدردی پیدا کرنے کے لئے "اکبری" کا بُرا انجام کافی نہیں ؟ کیا مُبتلا کا مرنا انسانی ہمدردی کا مقتضی نہیں ؟ اور کیا "ایامیٰ" میں انسانی جذبات اور ہمدردی کا خراج وصول کرنے کے لئے آزادی بیگم کی آخری وصیت کافی نہیں ۔

ہڈسن[ا] پلاٹ کو یوں بیان کرتا ہے۔

پلاٹ "وہ واقعات جو اشخاص قصہ کو پیش آئیں اور وہ افعال جو اُن سے سرزد ہوں مجموعی حیثیت سے پلاٹ کہلاتے ہیں"

اور پروفیسر بلس پیری[ا] نے اس کو دوسرے الفاظ میں یوں لکھا ہے۔

"پلاٹ نام ہے اُن واقعات کا جو اشخاص قصّہ کو پیش آئیں"

مگر پروفیسر پو (اڈگر ایلن)[ا] کے خیال کے مطابق جاذبیت۔ دلچسپی کے علاوہ واقعات میں لگاؤ اور تعلق ہونا ضروری ہے

مذکورہ بالا قیود اور تعریفوں کے لحاظ سے اگر ان کے ناولوں کو جانچا جائے تو مولانا کے ناول کسی طرح کسی ناول سے پیچھے نہیں رکھے جا سکتے۔ اس کا رام بابو سکسینہ صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے۔

"......[۵۲] اور معمولی واقعات زندگی کو ایک

لے دنیائے افسانہ [۵۲] تاریخ ادب اردو۔

منظم پلاٹ کی صورت میں دلچسپی سے بیان کیا۔"

مولانا نذیر احمد کے ناولوں میں بھی انکے اشخاص قصّہ سے حرکات اور افعال سرزد ہوتے ہیں ان کو زندگی کے طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس لئے پلاٹ تو یہیں ہڈسن اور ٹیلیپیسری کے مطابق پورا ہو گیا۔ اس کے علاوہ رہی دلچسپی وہ اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ ناول کیوں لکھے۔ اس لئے کہ ان کی لڑکیوں کے لئے دلچسپ کتابیں موجود نہ تھیں۔ پھیر ہر ذی فہم انسان خیال کر سکتا ہے کہ وہ کس قدر دلچسپ ہونگی اور قاری کی توجہ کو وہ کس حد تک جذب کریں گی۔ ادب اردو میں اکثر ناول ایسے پائے جاتے ہیں جن کے پلاٹ کا ارتقا غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ان کے یہاں نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات خود بخود پیدا ہو رہے ہیں اور جو افعال و حرکات اشخاص قصہ سے سرزد ہوتے ہیں وہ ارادۃً نہیں ہوتے بلکہ بالکل نیچرل ہیں۔ یہ بات پنڈت رتن ناتھ سرشار کے یہاں موجود نہیں "فسانہ آزاد" کو اگر پلاٹ اور واقعات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ مولانا کے ناولوں کے مقابلے میں زیادہ وقعت حاصل نہیں کر سکتا "فسانہ آزاد" میں مختلف

واقعات بیان کئے گئے ہیں یعنی کہیں میلے کا ذکر کہیں محرم اور کہیں
چہلم وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہے جس کا قصہ سے کوئی تعلق نہیں ان کے
بقیہ ناول بھی اس خامی سے بری نہیں اس کو رام بابو سکسینہ
صاحب بھی "تاریخ ادب اردو" میں یوں لکھتے ہیں۔

"پلاٹ مربوط اور منتظم نہیں ہوتے۔ "فسانہ
آزاد" ایک باقاعدہ پلاٹ کا قصہ نہیں لہذا مصنف
جب واقعات میں ایک ترتیب نظام قائم کرنے
کی کوشش کرتے ہیں تو ناکام رہتے ہیں وہ تمام متفرق
واقعات کو کبھی یکجا نہ کر سکے اور ان سے کبھی باقاعدہ
اور مرتب پلاٹ نہ تیار کر سکے یہی کمزوری ان کے
دوسرے ناولوں میں بھی نمایاں ہے"

مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کی طے شدہ خامیوں کے علاوہ
ایک خامی یہ بھی بتلائی جاتی ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے
ناولوں میں ایسے واقعات بیان کر جاتے ہیں جن کا قصہ
کے پلاٹ سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔

مولانا نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے پلاٹ بنانے میں یہ طریقہ اختیار
کیا ہے کہ پہلے اشخاص قصہ کے لئے اور ان کے افعال اور

حرکات سے جو واقعات پیدا ہوئے ان کو یکجا کرکے پلاٹ تیار
کرلیا ۔" مراۃ العروس" جو "اصغری واکبری" کے نام سے
زیادہ مشہور ہے اسی طرح تیار کی گئی تھی انھوں نے پہلے "اکبری"
کو لیا اور اس کے خراب چال چلن سے جو واقعات پیدا ہوئے
ان کو یکجا کرکے اس کے خلاف نیک چال چلن اور سلیقہ شعار
لڑکی "اصغری" کو لیا ۔ اس طرح پر یہ ناول تیار ہوگیا ۔ ایسے
پلاٹ غیر منتظم پلاٹ کہلاتے ہیں مگر اس کے علاوہ ان کے اور
ناول مثلاً "محصنات" "توبۃ النصوح" اور "ابن الوقت" وغیرہ
منتظم پلاٹ رکھتے ہیں ۔ سادہ پلاٹ کا کوئی ناول ان کے یہاں
موجود نہیں ۔ وہی کیا اس وقت بھی اردو ادب میں سادہ
پلاٹ کے ناول کافی تعداد میں موجود نہیں ہیں "فسانہ آزاد" کے متعلق "پنڈت
بشن نرائن در" کا خیال ہے کہ اس کا پلاٹ سادہ ہے گو کہ اس
میں سینکڑوں طرح کے واقعات بیان کئے گئے ہیں مگر ان کا
اصل قصہ سے کوئی تعلق نہیں ۔ ڈاکٹر ہادی رسوا کا ایک ناول
"امراؤ جان ادا" سادہ پلاٹ رکھتا ہے جس میں امراؤ جان ادا
کے کل حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں ۔
(نذیر احمد، سرشار اور رسوا کے ناولوں پر نظر ڈالنے کے بعد

جب ہم ادب اردو کے اسکاٹ مولانا عبدالحلیم شرر کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اکثر ناولوں کے پلاٹ غیر منتظم ہیں۔ ان کے چند بہترین ناول "ایام عرب" "فردوس بریں" "منصور موہنا" "فتح اندلس" وغیرہ کو چھوڑ کر اگر دیکھا جائے تو بعض ناولوں کے پلاٹ کی ترتیب بھی درست نہیں مگر مولانا نذیر احمد کی وہ ہستی ہے جس نے سب سے پہلے پلاٹ کی ترتیب اور اس سے واقعات کا لگاؤ اور اشخاص قصہ کا تعلق سمجھ لیا اس کے علاوہ شرر کے زیادہ تر ناولوں کے پلاٹ غیر ممالک سے لئے گئے ہیں مثلاً "ایام عرب" کو دیکھئے اس کا پلاٹ اس زمانہ سے لیا گیا ہے جب کہ عرب میں جاہلیت کا دور دورہ تھا "فلورا فلورنڈا" "فتح اندلس" کا پلاٹ ایسے زمانہ سے لیا گیا ہے جب کہ اسپین میں اسلامی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ "فردوس بریں" کو دیکھئے جس کا پلاٹ شرر نے ایران سے لیا ہے اور اس زمانہ کے حالات بیان کئے ہیں جب کہ جبال طالقان اور کوہ التمونت میں اسیسن لوگوں کا زور تھا اور ہزارہا بندگان خدا ان کے جور و ستم کا نشانہ بنتے تھے مولانا نذیر احمد نے ایسا نہیں کیا بلکہ غیر ملکی واقعات پر

اپنے ملک اور خاص کر اپنی قوم کے روزانہ زندگی کے واقعات کو ترجیح دی۔

اشخاص قصّہ پلاٹ اور اشخاص قصہ ایک حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں کبھی پلاٹ اشخاص قصّہ کے حرکات اور افعال کا مجموعہ ہوتا ہے اور کبھی اشخاص قصّہ واقعات ناول کے مطابق لے لئے جاتے ہیں نذیر احمد کے بعض ناولوں میں اشخاص قصہ کے مطابق واقعات لئے گئے ہیں جیسا کہ "مرآۃ العروس" سے ظاہر ہے مگر ان کے چند ناولوں میں واقعات کے مطابق اشخاص قصہ کا ارتقا ہوا ہے۔

ہر ناول میں اشخاص قصہ ضرورت کے مطابق ہونا چاہئیں کیونکہ جب وہ زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں تو قاری کو الجھن میں ڈالدیتے ہیں مولانا نذیر احمد نے اس کا بہت خیال رکھا کیونکہ ان کے ناولوں کا دراصل مقصد 'دلچسپ' ہونا تھا۔ انھوں نے کیرکٹروں کو اعتدال پر قائم رکھا ہے جس کی وجہ سے ان میں گڑبڑی پیدا نہیں ہوتی۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور علّامہ راشدالخیری میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے مگر سرشار کے بعض ناولوں میں ان کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہو جاتی ہے جس سے

قاری کو اُلجھن ہونے لگتی ہے اور قصہ کی دلچسپی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

اردو کے اکثر ناولوں میں یہ پایا جاتا ہے کہ ایک ہی ناول میں ایک ہی نام کے صرف دو نہیں بلکہ دو سے زیادہ کیرکٹر موجود ہوتے ہیں۔ جو قصہ کی ارتقائی منزلوں میں قاری کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ خود مولانا عبدالحلیم شرر کے اکثر ناولوں میں یہ بات ہے کہ ان کے اشخاص قصہ میں یکرنگی پائی جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک ہی ناول کے دو اشخاص کبھی کبھی بالکل ایک ہی معلوم ہوتے ہیں اور مختلف نظر نہیں آتے (جس کا ذکر آیندہ مولانا شرر کے ناولوں کے حوالہ سے کیا جائے گا) مولانا نذیر احمد کا اس خامی پر عبور حاصل کرنا ان کے لئے باعث فخر ہے کیونکہ ان کے سامنے اردو کوئی ایسا ناول موجود نہ تھا جس میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہوتا یہ ان ہی کی جدت طبع کا کام تھا۔

مولانا نذیر احمد ہمیشہ دو اشخاص قصہ ایک دوسرے کی ضد لیتے ہیں جن میں ایک کو عیوب کا شکار اور دوسرے کو سعادت مندی کا پرستار بنا کر تمام عیوب کو ظاہر کر دیتے ہیں

وہ ایسا کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ کیونکہ وہ سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں جن کو وہ بُرا خیال کرتے ہیں اس لئے وہ دو۲ اشخاص قصّہ ایسے لیتے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں یعنی ایک نیک اور دوسرا بد۔ وہ بُرے کام کے بد انجام دکھلاکر نیک اور سلیقہ شعار کو عزت اور نیک نامی بخشتے ہیں تاکہ وہ لوگ جو ان تمام بیہودہ افعال کا شکار ہو رہے ہیں گھبراکر اور بُرے نتائج دیکھکر ان کو چھوڑ دیں اور صراط مستقیم کی طرف رجوع ہو جاویں جو دنیا اور عقبیٰ میں سرخرو کرانے والی ہے یہ ہے وہ اخلاقی تعلیم جس کو "جان اڈنگٹن اسمتھ" کہتا ہے۔

"ہر فن[۱] لطیف کو اعلیٰ رُتبہ پر پہنچنے کے لئے اس میں اخلاقی جزو کا پایا جانا بیحد ضروری ہے"

مگر پنڈت رتن ناتھ سرشار میں یہ جزو بہت کم ہے جس کو رام بابو سکسینہ صاحب یوں لکھتے ہیں۔

"ان[۲] میں فلسفیت اور اخلاق آموزی کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے "فسانہ آزاد" کی آخری جلد اور

---

[۱] دنیائے افسانہ [۲] تاریخ ادب اردو۔

"ہشو" کے بھی آخری ابواب جن میں تعلیم نسوانٔ
تہیاسوفی اور ترک بینوشی وغیرہ کے متعلق وعظ نما تقریریں
ہیں نہایت بے مزہ اور بے اثر ہیں"

صرف یہی نہیں کہ سکسینہ صاحب نے اسی پر اکتفا کیا ہو بلکہ
وہ اعتدال کو چھوڑ کر زیادتی کی طرف بھی چلے گئے ہیں آگے چلکر
یوں لکھتے ہیں۔

"جب[۱] وہ اس کوچہ میں قدم رکھتے ہیں تو پھر وہ
سرشار نہیں رہتے"

اسکے علاوہ سرشار کی ناول نگاری میں ایسے ایسے عیوب
نکالتے ہیں جو دراصل اس قدر کم ہیں کہ اگر نظر انداز کر دیئے
جائیں تو ان سے سرشار کی خصوصیات میں کوئی اضافہ نہیں
ہوتا وہ اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ جن وجوہ کی بدولت ان کو
ایسا کرنا پڑا۔ وہ مجبور تھے ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"بعض جگہ اخلاق سے گری ہوئی اور غیر مہذب
باتوں کا بھی ان پر الزام لگایا جاتا ہے اور فی الحقیقت انھوں
نے بعض جگہ غیر مہذب اور سوقیانہ الفاظ استعمال

---

۱ ص ۵۲ تاریخ ادب اردو۔

گئے ہیں جن سے ہمارے اخلاقی احساسات کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے۔"

انھوں نے اپنے ناول جارج الیٹ کے ناولوں کے طرز پر لکھے ہیں ان کے تمام ناولوں میں اگر کوئی بھی مخرب اخلاق بات ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے تو میرے خیال سے بے جا سر مغزی ہوگی اور کوئی ایسی بات نہ ملے گی۔ وہ جہاں کہیں بھی لوگوں کو بیہودہ باتوں کو چھوڑ کر مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اخلاق پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں مولانا عبدالقادر صاحب اس کو "دنیائے افسانہ" میں یوں لکھتے ہیں۔

"ان میں وہ عیوب چن چن کر تبلائے گئے ہیں، جو شریف گھرانوں میں عام طور سے دیکھے جاتے ہیں اسٹیونسن کے ناول "ٹریزر آئیلنڈ" کی طرح یہ ہر قسم کے مخرب اخلاق عنصر حتّٰی کہ حسن و عشق سے بھی خالی ہیں کیونکہ عام مشرقی خیال کے مطابق یہ بات نہایت مذموم تصور کی جاتی ہے کہ صنف نازک کے ہاتھوں میں ایسی کتاب دی جائے جو اس کو عشق و محبت سکھانے والی ہو۔"

مولانا نے چند ناولوں میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے جو جناب عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے مگر بعض اوقات وہ قاری کو ایک دم مخاطب کر کے نیک باتیں بتلانے لگتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر ناول میں "حسن مثالی" ہونا چاہیئے۔ کیا مولانا نذیر احمد کے یہاں یہ موجود نہیں ؟ ہے اور ضرور ہے۔ ہر شخص اپنے لئے ہر چیز کا ایک معیار مقرر کر لیتا ہے۔ کیا مولانا نذیر احمد کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اپنے لئے کسی چیز کا معیار مقرر کر لیتے ؟ ان پر یہ الزام رکھنا کہ ان کے ناول حسن اور عشق سے بالکل خالی ہیں صرف بیجا ہی نہیں بلکہ زیادتی ہے۔ یہ محض ایک بہانہ ہے کہ "چونکہ ن کے ناول صنف نازک کے ہاتھوں میں جانے والے تھے اس وجہ سے انھوں نے اپنے اشخاص قصہ کو حسن اور عشق ں باتوں سے بالکل خالی رکھا" مولانا کا معیار حسن ہی دوسرا ہے جو موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق نہیں ہے مگر کچھ بھی ہو ناول نگار کی خصلت اور عادت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ا ہے جس چیز کا معیار اپنے لئے مقرر کر لے پھر مولانا نذیر احمد س کے ملزم کیوں کر ہوئے ؟ انھوں نے حسن کے متعلق اپنے یالات "فسانہ مبتلا" "رویائے صادقہ" اور "الحقوق والفرائض"

میں بیان کئے ہیں اور "امہات الامہ" میں حسن اور مفہوم حسن کو
اس طرح بیان فرمایا ہے۔

"فی اکثر الاحوال تکثیر ازدواج کی اصلی محرک حسن پرستی
ہوتی ہے اور حسن کا حال یہ ہے کہ ایک ملک کے لوگ اعضائے
خاص کی شکل وصورت اور رنگ وضع کی نسبت ایک قرارداد
کر لیتے ہیں کہ اس طرح کے اعضاء کو حسین سمجھیں گے۔
اوّل تو مذاق حسن سب جگہ یکساں نہیں۔ انگریز کرنجی آنکھوں
اور بھورے بالوں کے شیدا ہیں۔ ہم موٹی چور آنکھوں اور
کالے بالوں کے چینیوں نے ناک کو چہرے کی ہمواری میں
خلل انداز سمجھ کر بچوں کی ناک پر کمانیاں چڑھا چڑھا آخر
ناک کو مٹا چھوڑا۔ حبش میں کوئی ہمارے ملک کا گیہواں
رنگ آدمی جا نکلے تو اس کو مبروص سمجھ کر اسکی چھاؤں
سے دور بھاگیں۔ حبشیوں کے ہونٹوں کو تو سنا ہو گا۔
"لب زبرینش تا پرّہ بینی رسیدہ ولب زیرینش تا زنخدان
فروہشتہ" اختلاف مذاق پر طرہ یہ کہ ہر شخص کو اپنے مذاق
کے مطابق حسن سے یکساں طور پر ہیجان ہوتا ہے حالانکہ
اعضاء خارجی کے حسن کو کیسا بھی ہو نفس خواہش میں

کچھ بھی دخل نہیں مثلاً ہمارے شاعر ناک کی شان میں
کہتے ہیں۔ ع

آتشِ حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی

لیکن ہمارے نزدیک اگر کسی کی ناک اچھی ہے تو وہ اسی
ناک والے کے کام کی ہے وہ بھی اس صورت میں کہ
اس کی قوّت شامّہ صحیح ہو۔ نتھنوں کی راہ آمد و شد
میں رکاوٹ نہ ہو کسی غیر کو اس کی ناک سے کیا تعلق
یہ ہے اولاد آدم کی سمجھ ؎

بر خیالِ نام شان و ننگ شاں
بر خیالِ صلح شان و جنگ شاں

بایں ہمہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدمی کی فطرت میں جہاں اور
باتیں ہیں ایک بات یہ بھی ہے کہ اوائلِ عمر میں اسکی طبیعت جو
رنگ پکڑ لیتی ہے وہ تا بزیست زائل نہیں ہوتا یعنی ہر شخص
اپنے مذاق کے مطابق حسن صورت کی طرف فطرۃً مائل ہوگا
اور اس میلان میں اس پر کچھ الزام نہیں غایۃ مافی الباب
یہ میلان طبیعی ہے اصل قوت کا۔ پس میلان کا بُرا بھلا ہونا
موقوف ہے اصل قوت کے حسن یا قبیح ہونے پر اور اصل

قوت خداداد یعنی فطری قوت ہے کہ عمر کی ایک حد
خاص کو پہنچ کر خود بخود ظہور کرتی ہے اور تمام خداداد
اور فطری قوتیں حسن میں اس واسطے کہ کسی مصلحت
سے خدا نے دی ہیں۔"

یہ ہے مولانا کا معیار حسن۔ اس کو پڑھ کر غالباً کوئی ایسا شخص
نہ ہوگا جو ان پر یہ الزام لگاوے گا کہ وہ اپنے ناولوں میں "حسن مثالی"
قائم نہیں رکھتے (۔وہ نہیں چاہتے کہ حسن کی ننگی تصویریں یوں
کتابوں کے صفحوں پر ظاہر ہوں اور وہ مخرب اخلاق ثابت
ہوں آج کل کے حسن کا معیار کیا ہے؟ غالباً کسی کو صحیح اندازہ نہ
ہوگا کیونکہ ہر شخص اس کا ایک علیحدہ معیار رکھتا ہے مگر زمانۂ
حال کے ناول نگار حسن کو کل ناول کے افعال کا مرتکب ٹھہراتے
ہیں اور اس حسن کا اثر صرف اسی وقت تک رہتا ہے جب تک
وصال نہیں ہوتا۔ وصال ہوتے ہی نہ وہ حسن رہتا ہے اور نہ وہ
اس کا اثر۔ صرف یہی نہیں وصال ہوتے ہی ان کے ناول
بھی ختم ہو جاتے ہیں اس کو موجودہ سوسائٹی کی برکت کہا جائے
یا نحوست کہ اول تو حسن کو سب سے اعلیٰ درجہ دیا ہے پھر اس کو
اس بُری طرح روندا گیا ہے کہ خدا ہی بچانے والا ہے جتنا

حسن انسان کے اخلاق پر اچھا اثر ڈالنے والا تھا آج اتنا ہی مخرب اخلاق ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب جو اس کا ہو سکتا ہے تو یہی کہ ہر وہ شخص جس نے اُردو میں تھوڑی بہت مہارت پیدا کر لی قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور ناول لکھنا شروع کر دیا۔ شروع ناول میں شریف زادیوں کی بازاری لوگوں سے آنکھیں لڑوا کر ان کے عاشق پیدا کر دیئے۔ پھر ان کے حسن کا چرچا کیا۔ کہیں کہیں کسی شریف زادی کو کسی کے گھر میں اُتروا کر اس کے حسن کی بہار لٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہیں حسن کی مقناطیسی کشش دکھلاتے ہیں اور کسی نہ کسی کو اس کا ایسا عاشق بنا دیتے ہیں کہ مجنوں بھی اُس سے آ کر سبق حاصل کرے۔ غرض ہماری سوسائٹی میں دن بدن اس طرح کے ناول بڑھتے جاتے ہیں جن میں حسن مخرب اخلاق قرار دیا جاتا ہے۔ کیا دراصل وہ ہے بھی؟ نہیں ہرگز نہیں اس کا الزام سوسائٹی کے شوق اور ان ناتجربہ کار ناول نگاروں پر عائد ہوتا ہے جو آئے دن ایسے ناول لکھ کر پبلک کی خدمت کیا کرتے ہیں۔

(مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اپنے ناولوں میں "حسن مثالی" قائم رکھا ہے "فردوس بریں" میں "زمرد" کو جب ہم سے روشناس کراتے ہیں تو لکھتے ہیں۔

"......الغرض[1] ایک گدھے پر تو یہ نوجوان سوار ہے اور دوسرے پر ایک اٹھارہ انیس برس کی پری جمال موٹے موٹے کپڑے اور بھدّے پوستین اس کے زاہد فریب حسن کو بہت کچھ چھپا رہے ہیں مگر ایک ماہوش کی شوخ ادائیاں کہیں چھپائے چھپتی ہیں جس قدر چہرا کھلا ہے۔ حسن کی شعاعیں دے رہا ہے اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی نازنین و حسین پھر نظر نہ آئے گی"

آگے چلکر مولانا خود لکھتے ہیں۔

"اس دلربا لڑکی کے حسن و جمال کی تصویر دکھانا مشکل ہے"

مگر اس کے چہرے کا حسن اور جمال یوں دکھایا ہے۔

"گول آفتابی چہرہ جیسا کہ عموماً پہاڑی قوموں میں ہوتا ہے۔ ستے اور کھنچے ہوئے سُرخی کی جھلک دینے والے گال۔بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔لمبی نوکدار پلکیں۔بلند مگر کسی قدر پھیلی ہوئی۔نازک نازک اور خمدار ہونٹھ۔

---

[1] فردوس بریں مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۲۱ء

کچھ بھی دخل نہیں مثلاً ہمارے شاعر ناک کی شان میں کہتے ہیں ع

آتش حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی

لیکن ہمارے نزدیک اگر کسی کی ناک اچھی ہے تو وہ اسی ناک والے کے کام کی ہے وہ بھی اس صورت میں کہ اس کی قوّت شامّہ صحیح ہو۔ نتھنوں کی راہ آمد و شد میں رکاوٹ نہ ہو کسی غیر کو اس کی ناک سے کیا تعلق یہ ہے اولاد آدم کی سمجھ سے

بر خیالِ نام شان و ننگ شاں
بر خیال صلح شان و جنگ شاں

بایں ہمہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آدمی کی فطرت میں جہاں اور باتیں ہیں ایک بات یہ بھی ہے کہ ابتدائی عمر میں اسکی طبیعت جو رنگ پکڑ لیتی ہے وہ تا بزیست زائل نہیں ہوتا یعنی ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق حسن صورت کی طرف فطرۃً مائل ہوگا اور اس میلان میں اس پر کچھ الزام نہیں غایۃ مافی الباب یہ میلان مہیج ہے اصل قوت کا۔ پس میلان کا بُرا بھلا ہونا موقوف ہے اصل قوت کے حسن یا قبیح ہونے پر اور اصل

قوت خداداد لینی یعنی فطری قوت ہے کہ عمر کی ایک حد
خاص کو پہنچ کر خود بخود ظہور کرتی ہے اور تمام خداداد
اور فطری قوتیں حسن ہیں اس واسطے کہ کسی مصلحت
سے خدا نے دی ہیں۔"

یہ ہے مولانا کا معیار حسن۔ اس کو پڑھ کر غالباً کوئی ایسا شخص
نہ ہوگا جو ان پر یہ الزام لگا دے گا کہ وہ اپنے ناولوں میں "حسن مثالی"
قائم نہیں رکھتے (وہ نہیں چاہتے کہ حسن کی ننگی تصویریں یوں
کتابوں کے صفحوں پر ظاہر ہوں اور وہ مخرب اخلاق ثابت
ہوں آج کل کے حسن کا معیار کیا ہے؟ غالباً کسی کو صحیح اندازہ نہ
ہوگا کیونکہ ہر شخص اس کا ایک علیحدہ معیار رکھتا ہے مگر زمانۂ
حال کے ناول نگار حسن کو کل ناول کے افعال کا مرتکب ٹھہراتے
ہیں اور اس حسن کا اثر صرف اسی وقت تک رہتا ہے جب تک
وصال نہیں ہوتا۔ وصال ہوتے ہی نہ وہ حسن رہتا ہے اور نہ وہ
اس کا اثر۔ صرف یہی نہیں وصال ہوتے ہی ان کے ناول
بھی ختم ہو جاتے ہیں اس کو موجودہ سوسائٹی کی برکت کہا جائے
یا نحوست کہ اول تو حسن کو سب سے اعلیٰ درجہ دیا ہے پھر اس کو
اس بری طرح روندا گیا ہے کہ خدا ہی بچانے والا ہے جتنا

حسن انسان کے اخلاق پر اچھا اثر ڈالنے والا تھا آج اتنا ہی
مخرب اخلاق ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب جو اس کا ہو سکتا ہے
تو یہی کہ ہر وہ شخص جس نے اردو میں تھوڑی بہت مہارت پیدا
کرلی قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور ناول لکھنا شروع کر دیا۔ شروع
ناول میں شریف زادیوں کی بازاری لوگوں سے آنکھیں لڑوا کر
ان کے عاشق پیدا کر دیئے۔ پھر ان کے حسن کا چرچا کیا۔ کہیں
کہیں کسی شریف زادی کو کسی کے گھر میں اتروا کر اس کے حسن
کی بہار لٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ کہیں حسن کی مقناطیسی کشش دکھلاتے
ہیں اور کسی نہ کسی کو اس کا ایسا عاشق بنا دیتے ہیں کہ مجنوں بھی اُس
سے آکر سبق حاصل کرے۔ غرض ہماری سوسائٹی میں دن بدن اس طرح
کے ناول بڑھتے جاتے ہیں جن میں حسن مخرب اخلاق قرار دیا
جاتا ہے۔ کیا دراصل وہ ہے بھی؟ نہیں ہرگز نہیں اس کا
الزام سوسائٹی کے شوق اور ان ناتجربہ کار ناول نگاروں پر عائد ہوتا
ہے جو آئے دن ایسے ناول لکھ کر پبلک کی خدمت کیا کرتے ہیں۔
(مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی اپنے ناولوں میں "حسن مثالی" قائم رکھا
ہے "فردوس بریں" ہیں "زمرد" کو جب ہم سے روشناس
کراتے ہیں تو لکھتے ہیں۔

"......الغرض[1] ایک گدھے پر تو یہ نوجوان سوار ہے اور دوسرے پر ایک اٹھارہ انیس[19] برس کی پری جمال موٹے موٹے کپڑے اور بھدّے پوستین اس کے زاہد فریب حسن کو بہت کچھ چھپا رہے ہیں مگر ایک ماہوش کی شوخ ادائیاں کہیں چھپائے چھپی ہیں جس قدر چہرا کھلا ہے۔ حسن کی شعاعیں دے رہا ہے اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی نازنین وحسین پھر نظر نہ آئے گی"

آگے چلکر مولانا خود لکھتے ہیں۔

"اس دلربا لڑکی کے حسن وجمال کی تصویر یہ دکھانا مشکل ہے"

مگر اس کے چہرے کا حسن اور جمال یوں دکھایا ہے۔

"گول آفتابی چہرہ جیسا کہ عموماً پہاڑی قوموں میں ہوتا ہے۔ ستے اور کھنچے ہوئے سرخی کی جھلک دینے والے گال۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ لمبی نوکدار پلکیں۔ بلند مگر کسی قدر پھیلی ہوئی۔ نازک نازک اور خمدار ہونٹھ۔

---

[1] فردوس بریں مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۲۱ء

باریک اور ذرا پھیلی ہوئیں باچھیں۔ چھوٹے سے سانچے میں ڈھلی ہوئی نوکدار ٹھڈی۔ شربگیں اور معمولاً جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ شوخ اور بے چین چشم و ابرو اور اس تمام سامان حسن کے علاوہ تمام اعضا و جوارح کا غیر معمولی تناسب ہر شخص کو بے تاب و بے قرار کر دینے کے لئے کافی ہے۔"

اسی طرح مولانا شررؔ نے اپنے مختلف ناولوں میں حسن کا معیار مختلف رکھا ہے "منصور موہنا" میں "موہنا" کا حسن اور "دلکش" میں "حسینی" کا حسن وغیرہ مختلف پہلو لئے ہوئے ہے۔ شررؔ کے علاوہ حکیم محمد علی خاں بھی اپنے ناولوں میں "حسن مثالی" قائم رکھتے ہیں۔ "اختر حسینہ" میں "حسینہ" کا سا حسن اور "رام پیاری" میں اسکی ہیروئن کا سا بے نظیر حسن کسی میں نظر نہیں آتا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بھی اس کو اپنے ناولوں میں نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے اشخاص قصہ زیادہ تر آپس میں ملتے جلتے ہیں یعنی ان کی حرکات و سکنات اور اعتقادات وغیرہ سب ایک ہی طرح کے معلوم ہوتے ہیں بعض اوقات تو یہ دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ہی خاندان کی دو ہستیاں ہیں کیونکہ ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا قریب قریب ایک ہی طرح کے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں مگر یہ بات حکیم محمد علیخاں

کے ناولوں میں نہیں پائی جاتی ان کا ہر ناول ایک نیا شخص قصہ پیش کرتا ہے جس کی وضع قطع اور چال ڈھال دوسروں سے بالکل مختلف ہوتی ہے اس کے اعتقادات اور چال چلن میں بھی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ ایسا شخص قصہ کو قاری جلد فراموش نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ہر ایک سے مختلف ہوتا ہے (مولانا نذیر احمد کے اشخاص قصہ قاری کے دماغ پر زیادہ دیر تک اثر پذیر نہیں ہوسکتے مولانا کے اشخاص قصہ دیکھنے کے بعد ہم جب مولانا شرر کے اشخاص ناول کو دیکھتے ہیں تو ان کو بھی اس خامی سے بری نہیں پاتے) صرف یہی نہیں بلکہ ان کے بعض ناول کے دو اشخاص قصہ بھی مختلف نظر نہیں آتے۔ دونوں کا طرز گفتگو حرکات وسکنات وغیرہ سب ایک ہوتے ہیں۔ "ایام عرب" میں زہیر اور عمر" دو اشخاص قصہ ہیں ان دونوں کے کردار میں کسی طرح کا بھی فرق نہیں ہے دونوں کے مقاصد ایک اور ان کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی ایک۔ اگر ان دونوں کے نام بدل کر رکھ دیئے جائیں تو ان کے کرداری ارتقا اور ان کے افعال و حرکات میں کوئی فرق نہیں آتا بعینہ یہی حالت اس ناول کی دونوں ہیروئین حلیمہ اور حبیبہ کی ہے۔

(مگر جب ہم پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کو دیکھتے ہیں تو ہماری مایوسی ایک حد تک رفع ہو جاتی ہے۔ ان کے ہر ناول کے اشخاص قصہ بالکل ایک ہی ہوتے ہیں یعنی ان کے حرکات وسکنات اور مقاصد مختلف ہوتے ہیں "فسانہ آزاد" کو اگر ہم بھول بھی جائیں تب بھی ہم کو "خوجی" جیسا شخص قصہ ہمیشہ یاد رہے گا کیونکہ اس کا نمایاں طرز اور چال چلن کے علاوہ دیگر انفرادی خصوصیات انسان کے دماغ پر زیادہ دیر تک اثر رکھنے والی ہیں)

حافظ نذیر احمد کے ناولوں میں ایک عام بات یہ پائی جاتی ہے کہ جب وہ ایک چیز کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو اسکی ضد بھی پیش کرتے ہیں اگر وہ برائی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو نیکی کا ذکر ضرور کرتے ہیں اس کی مثال "مرآۃ العروس" میں موجود ہے یعنی انھوں نے "اکبری" کو بدسلیقہ۔ بدتمیز۔ سفلہ اور چھچھوری دکھلایا ہے اور اس کے خلاف "اصغری" کو نیک نفس۔ باسلیقہ۔ باتمیز اور سعادت مند ظاہر کیا ہے مگر ایک عیب صرف مولانا ہی میں نہیں بلکہ تمام ناول نگاروں میں پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب وہ کسی شخص قصہ کی برائی کرتے ہیں پھر اس کی نیکی اور سلیقہ شعاری کی طرف بالکل

توجہ نہیں کرتے اور اگر کسی کی نیکیاں بیان کرتے ہیں تو اُس کی برائیوں کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں یہ بات شرر اور سرشار کے علاوہ حکیم محمد علی خاں کے ناولوں میں بھی موجود ہے ۔ "اختر حسینہ" میں وہ حسینہ کی برائیوں کا کہیں بھی ذکر نہیں کرتے جہاں دیکھو تعریفوں کے طومار باندھ دیئے ہیں (مولانا نذیر احمد نے جو ایسا کیا اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ وہ چونکہ برائی اور اچھائی کو علیحدہ علیحدہ کرکے دکھلانا چاہتے تھے) اس وجہ سے انھوں نے یہ دو اشخاص قصہ لے لئے۔ ان میں سے ایک بھولا بھٹکا ہوا ہے جو راہ راست سے دور ہے اور دوسرا اس بھولے ہوئے شخص قصہ کو صراط مستقیم بتلاتا ہے یہ طریقہ قریب قریب ان کے ہر ناول میں اختیار کیا گیا ہے۔ قصہ کے بقیہ اشخاص اس شخص قصہ کے علاوہ بدتمیز، سفلہ، ضدی، مکار، کاہل، فریبی، دغاباز اور بدسلیقہ ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی طرح شرر کے معاشرتی یا اخلاقی ناولوں سے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور نکلتا ہے۔ آپ کے ناولوں کے متعلق مولانا عبدالقادر صاحب "دنیائے افسانہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"کردار نگاری میں بعض جگہ اس قدر نفسیاتی طریقہ سے

کام لیا گیا ہے کہ انگریزی ناول نگار جارج ایلیٹ کے
ناول یاد آجاتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جارج ایلیٹ
کی طرح ان کی بڑی عمر نے ان کو مختلف
سوسائیٹوں کے مطالعہ کا نہایت عمدہ موقع دیا تھا
دونوں اپنے افسانوں میں ایک خاص مذہبی اعتقاد کی
طرف اشارہ کرتے ہیں ۔"

بیشک مولانا[1] نے (۷۶) چھہتر برس کی عمر پائی تھی ناول نگاران
اردو میں اتنی دراز عمر شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو سرشار
(۵۶) چھپن برس زندہ رہے اور شرر نے (۶۶) برس کی عمر
میں انتقال کیا پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ انھوں نے آنکھ بند
کر کے اپنی اتنی عمر گزار دی ہوگی اور دنیا کے واقعات سے
بالکل بے بہرہ رہے ہوں گے ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے
کہ انھوں نے دنیا کو کس نظر سے دیکھا اور کیا کیا اس میں گلکاریاں
کیں ۔ وہ اسکی بے ثباتی اور ناپائداری پر برابر آنسو بہاتے
رہے ۔ مختلف سوسائٹی اور انجمنوں کے متعلق جناب عبدالقادر صاحب کا
یہ خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ غالباً اردو زبان کا کوئی ناول نگار

---

[1] مولانا کے حالات زندگی ملاحظہ ہوں ۔

اس حالت میں پیدا نہیں ہوا۔ جس حالت میں کہ مولانا نذیر احمد پیدا ہوئے تھے کسی نے اس مشکل سے تعلیم حاصل نہیں کی اس کے علاوہ گداگری کا سہرا بھی مولانا نذیر احمد ہی کے سر بندھا۔ اس حالت سے ترقی کرتے کرتے "شمس العلماء" ہوئے "ایل ایل ڈی" اور "ڈی او ایل" کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جب غریب تھے غریب لوگوں سے خوب ربط ضبط بڑھا رکھا تھا اور ان کا طرز معاشرت خوب ذہن نشین کر رکھا تھا جب ڈپٹی کلکٹر ہوئے تو اعلیٰ سوسائٹی کے حکام سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے جلسوں میں شریک رہے۔ بڑی بڑی تقریریں کیں۔ تجارت کے شوق میں دن رات مسلمانوں کی دوکانوں پر حساب لینے کے لئے چکر لگایا کرتے تھے۔ سیکڑوں باتیں روزانہ آنکھوں کے سامنے ہوتی تھیں۔ غرض ان کو امیروں اور غریبوں کی زندگی کے حالات کا بخوبی علم تھا کیونکہ وہ ان دونوں حالتوں میں زندگی بسر کر چکے تھے۔ اب رہا کرداری ارتقا تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انکے ناولوں کے اشخاص قصہ میں کرداری ارتقا گو کمی کے ساتھ ہے مگر موجود ضرور ہے انھوں نے مسلمانوں کی سماجی حالت کے اس پہلو کو لیا ہے جس میں تمام خرابیاں موجود تھیں اور

اب بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ ان کے دور کرنے کی انتہائی کوشش کرتے رہے ہیں۔ مگر کہاں تک وہ ان برائیوں کو دور کرتے یہ ضرور ہے کہ اور ناول نگاروں کی طرح ان کے ناولوں کے اشخاص قصہ ارتقائی منزلیں بہت کم طے کرتے ہیں۔ 'نصوح' اور اس کے خاندان کو لے لیجئے 'کلیم' ۔ دیکھئے مرتے مر گیا مگر ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی 'سلیم' کے کیرکٹر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چال چلن پر ضرور اثر پڑا ہے۔ اور اس کی حالت آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی گئی ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے کردار میں ارتقا موجود ہے۔ مولانا شرر بھی اس غلطی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کردار نگاری ان کے یہاں بھی کم ہے۔ ان کے بعض شخص قصہ کرداری ارتقا میں ایک دم ترقی کرتے ہیں اور پھر تنزل کی طرف آتے ہیں۔ تاہم "ایام عرب" "زوال بغداد" "منصور موہنا" "ملک العزیز ورجنا" "فردوس بریں" "قیس و لبنیٰ" اور "دلکش" اس کی کسی حد تک تلافی کر دیتے ہیں۔

اگر اشخاص قصہ کے کردار میں استقلال دیکھا جائے تو میرے خیال میں شرر اور سرشار دونوں میں سے کوئی بھی ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا کیونکہ شرر کے اشخاص قصہ معمولی سی

تکلیف پڑنے پر بہت جلد افسردہ ہو کر جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ صبر ایک ایسی چیز ہے جو صرف ان دونوں ناول نگاروں کی ہیروئن کے کرداری ارتقا کا جزو ہے۔ مولانا شرر کی تمام ہیروئن اپنے اوپر تکالیف برداشت کرتی ہیں اور اُف تک بھی نہیں کرتیں۔ "فردوس بریں" میں "زمرد" "ایام عرب" میں حلیمہ وجبیبہ" "منصور موہنا" میں "موہنا" "ناگنش" میں "حسینی" "قیس ولبنیٰ" میں "لبنیٰ" اور "طاہرہ" میں "طاہرہ" اس کی ایسی مثالیں ہیں جو قیامت تک ادب اردو پہ چمکتے ہوئے تاروں کی طرح روشن رہیں گی۔ یہی حال حکیم محمد علی خاں کے ناول "اختر حسینہ" کے ہیرو "اختر" کا ہے وہ بہت جلد نا اُمید ہو کر پہاڑ کے اوپر سے گر کر اپنی جان دینا چاہتا ہے مگر "حسینہ" ہے کہ اپنے پیارے محبوب سے الگ پردہ میں قید اس کی صورت دیکھنے کو تڑپ رہی ہے کوئی کیا کرے ایسی حالت میں سب ضبط کرنا پڑتا ہے کیونکہ راز فاش ہو جانے کا ڈر پوری طرح غالب ہوتا ہے۔ نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" میں "نصوح" کی مستقل مزاجی دیکھئے۔ اپنے گھر کو ٹھیک کرنے کے لئے طرح طرح کے سامان کرتا ہے" کلیم" کا مرتے وقت تک

پیچھا کرتا ہے اور صبر کے ساتھ اس خیال پر کاربند رہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ راہ راست پر ضرور آجائے گا۔ "مراۃ العروس" میں "اکبری خانم" اپنی ماما کے خلاف کس قدر صبر اور استقلال سے کام لیتی ہے جب کہ وہ روزانہ ایک نہ ایک جھوٹ بات اس کے خلاف کہتی ہے۔ سرشار اس وجہ سے ان کے ہم پلہ نہیں کہ استقلال اور صبر سے ان کے اشخاص قصہ بالکل ناواقف ہیں وہ اس قدر جلد باز اور بے صبر ہوتے ہیں کہ یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہونے پاتا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں قاری کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے۔ اور پھر ناول پڑھنے کو طبیعت نہیں چاہتی مولانا عبدالغفار صاحب "دنیائے افسانہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"یہی پہلا شخص نظر آتا ہے جس نے اردو افسانوں میں کردار نگاری کا اضافہ کیا، باوجود اس کے ہم "فسانہ آزاد" کو ناول نہیں کہہ سکتے کیونکہ ناول کی دو اہم خصوصیات یعنی پلاٹ کی ترتیب اور تسلسل افعال اور اشخاص قصہ کے کردار میں استقلال مفقود ہیں۔"

اس کا رام بابو سکسینہ صاحب نے بھی یوں اعتراف کیا ہے۔

".........اسی وجہ سے ان کے کیرکٹروں میں
ہمواری اور یکرنگی نہیں ہے جو قصے کے سلسلے میں سینکڑوں
رنگ بدلتے رہتے ہیں وہ وقتی ضروریات کو مد نظر
رکھتے ہیں اور کیرکٹروں کے خصائص ان کے دماغ میں
قائم نہیں رہتے اسی وجہ سے وہ ان کو نباہ نہیں سکتے
فطری بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے ان کا
قلم سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے وہ لکھتے
رہتے ہیں خواہ طبیعت حاضر ہو یا نہ ہو جس کا نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ ان کی فکر میں قوت پرواز نہیں رہتی
تو وہ زمین پر کھسلنے لگتے ہیں"

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ کرداری ارتقا کے ساتھ
ساتھ ظاہری ملبوسات بھی تبدیل ہوتے رہیں اگر کسی ناول نگار
کے ناولوں میں یہ بات پائی جاتی ہے تو دراصل وہ سونے پر
سہاگہ ہے مگر یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کیرکٹر کے ارتقا کے
ہمراہ ظاہری ملبوسات خود بخود تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ناول نگاران اردو میں ایک خاص نقص یہ ہے کہ اگر
ان کے کسی شخص قصہ کا ارتقا رک جاتا ہے تب بھی وہ اس کو

تمام قصے میں نباہنے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر تک اس کو ضرور کسی نہ کسی طرح لاتے ہیں خواہ وہ کسی حالت میں کیوں نہ ہو۔ شکسپیر کے ڈرامے "جیسا تم چاہو" میں جب "آدم" جیسے شخص قصہ کا ارتقا رک جاتا ہے تو وہ اس کو ایک دم قصہ سے خارج کردیتا ہے اور قصہ کے اختتام تک اس کا ذکر نہیں کرتا۔ بڑے بڑے ناول نگاران اردو گو کہ اس خامی سے محفوظ ہیں مگر یہ دھبہ اردو ادب کے دامن پر اُن نام نہاد پیشہ ور ناول نگاروں کا لگایا ہوا ہے جو آئے دن روپیہ پیدا کرنے کے لئے ایسے ناول لکھا کرتے ہیں اگر اردو ادب میں آئندہ ایسے ناول نگار پیدا ہوتے رہے تو اس زبان کے فن ناول نگاری کا خدا ہی مالک ہے۔ سرشار اور نذیر احمد نے بھی اپنے ناولوں میں شکسپیر ہی کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔

اکثر اردو ادب میں ایسے ناول ملتے ہیں جن میں ہم اشخاص قصہ کی گفتگو سنتے ہیں اور ان کی ہر حرکت پر غور کرتے ہیں مگر پھر بھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اُنکے دل پر کیا کیفیت طاری ہے اور وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ناول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہونا چاہئے کہ پڑھنے والے کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ دراصل

شخص قصہ کے اوپر کس طرح کے جذبات کا اثر ہے اور ان کا
کیا مطلب ہے اگر غصہ ہے تو تیور اور طرز گفتگو فوراً ظاہر کردیں گے
اگر خوش ہے تو چہرہ کی بشاشت اور زندہ دلی قاری کو فوراً یہ
بتلادے گی کہ اس کی کیا کیفیت ہے اور وہ کس عالم میں ہے۔
نذیر احمد کے ناول اس خصوصیت کے لئے خاص طور پر مشہور
ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں وہ
فوراً ان کی کیفیت اور تیور سے ظاہر ہو جاتے ہیں جس کی وجہ
سے قاری اس کی حالت کو سمجھ کر اپنی کل توجہ ناول کی طرف
مبذول کر دیتا ہے ان کے جذبات کا غلبہ نہ صرف ان پر قوی
ہوتا ہے بلکہ انکا اتنا ہی اثر قاری کے اوپر بھی طاری ہو جاتا ہے۔
خواب میں نصوحؔ کی حالت اور اس کے بعد کی کیفیت ظاہر
کرتی ہے کہ اس کے دل پر اس خواب کا کتنا اثر تھا صرف
یہی نہیں بلکہ اپنے (نصوح) گھر کے تمام اشخاص کی حالت
درست کرنے میں اس کی مستقل مزاجی اور دل کی بے چینی
اس کے دلی جذبات کا بہت عمدہ نمونہ ہیں "مراۃ العروس"
میں "اصغری خانم" کے دل کی حالت اور اس کی خادمہ یا
ماما کا جلنا ہم پر بخوبی عیاں ہے "مبتلا" کا ہریالی " کے

واسطے دیوانہ ہونا کوئی ایسی بات نہیں جو کسی سے پوشیدہ ہو
اس کا 'ہریالی' کو ماما بنا کر گھر میں داخل کرنا اس کی انتہائی
محبت اور الفت کی دلیل ہے مگر مولانا شررؔ میں بھی ہم کو
بعض اوقات یہ نقص ملتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے
کہ انھوں نے انسانی جذبات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی
ہے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں مگر نہایت
افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ جہاں کہیں وہ جذبات
اور احساسات کی مکمل تصویر اُتارنے کی کوشش کرتے
ہیں ناکامیاب نظر آتے ہیں "فردوس بریں" میں انھوں
نے حسین کے جذبات اور بیقراری کو بخوبی ظاہر کیا ہے مگر
اس کا قاری کے دل پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ
"قیس ولبنیٰ" کو بھی دیکھ لیجئے جس میں انھوں نے جذبات
کی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ اس سے
زیادہ موثر پیرایہ اور طرز غالباً ان کے اور کسی ناول کا نہیں ہے
سرشارؔ کی طرف رجوع ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی
جذبات نگاری میں مولوی نذیر احمد سے بہت پیچھے رہ گئے
ہیں اس کا اعتراف رام بابو سکسینہ صاحب نے بھی "تاریخ

ادب اردو" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ان میں جذبات کی بھی کمی ہے۔ اسی وجہ سے ان
کی تصانیف میں تصادیر درد و غم کا پتہ نہیں
ان کی جذبات نگاری جہاں کہیں ہوتی ہے مصنوعی
معلوم ہوتی ہے اور ادھر اُدھر کے اقوال و اشعار
سے اِس کمی کو وہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔"

مقاصد

جب کوئی شخص افسانہ یا ناول لکھتا ہے
تو اس کے پیش نظر کوئی خاص مقصد ضرور
ہوتا ہے جس کی تکمیل اس کی تصنیف کردیتی ہے۔ مولوی
نذیر احمد نے جتنے ناول لکھے ان کے اندر مولانا کا کوئی نہ کوئی
مقصد ضرور تھا کچھ اصحاب یہ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ کتابیں
انھوں نے اپنی لڑکیوں کے لئے لکھی تھیں اس لئے ان
میں اخلاقی نصیحت پائی جاتی ہے ورنہ وہ بھی اس سے
خالی ہوتیں اور اگر انکا کچھ مقصد تھا تو صرف لڑکیوں کو اخلاقی
تعلیم دینا تھا۔ چند اشخاص کی یہ رائے ہے کہ مولانا نے اپنے
ناولوں میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے مذہب کی باتیں
بیان کی ہیں اس لئے دوسری قوم کے لئے زیادہ فائدہ مند

نہیں ہوسکتیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سوالات کس حد تک صحیح ہیں یہ ضرور ہے کہ مولانا کے دو تین ناول مثلاً "مراۃ العروس" "بنات النعش" اور "ایامیٰ" وغیرہ جو لڑکیوں کے لئے لکھے گئے ہیں ان کے فطری رجحان کو ظاہر کرتے ہیں انہیں مذہب کی پابندی۔ والدین کی فرمانبرداری۔ دوسروں پر مہربانی کرنا۔ پڑوسیوں سے برتاؤ۔ بھائیوں اور بیٹیوں سے سلوک۔ امور خانہ داری کی ضروری باتیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور در اصل انکا مقصد بھی یہی تھا، مگر یہ کہنا کہ انھوں نے نوجوان لڑکوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے قطعی غلط ہے۔ "توبۃ النصوح" "ابن الوقت" اور "محصنات یا فسانہ مبتلا" وغیرہ کتابیں لڑکوں کو تعلیم دینے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ ان ناولوں میں ان کو مذہبی اعتقادات کی طرف رجوع کرکے اخلاقی تعلیم دی ہے موجودہ عشق بازی کے علاوہ دو بیویوں کو نکاح میں لانے کے نقائص اور ان تکالیف کا جو انسان کو ان معاملات میں اٹھانا پڑتی ہیں "فسانہ مبتلا" میں ہو بہو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اپنے ملک کی تمام خوبیوں کو چھوڑ کر طلبیا اور

من چلے اصحاب جو غیر ممالک کے اطوار اور ڈھنگ عمدہ خیال کر کے اختیار کر لیتے ہیں اور جو دراصل بڑے ہوتے ہیں مولانا نے "ابن الوقت" میں اس قدر واضح طور پر بتلایا ہے کہ کہیں اور اس کا پایا جانا مشکل ہے "ایامی" صرف عورتوں کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ مردوں کے لئے بھی ہے اس میں مولانا نے اپنی قوم کے لوگوں کو اپنے فرائض کی طرف رجوع کیا ہے جس کو وہ فراموش کر چکے تھے یعنی بیوہ عورتوں کی شادی۔ جب ایک قوم کے مرد جن کے سامنے عورتوں کی زبان نہیں چل سکتی، کسی بات کے خلاف ہوں گے تو وہ بے بیچاری پردہ کی بیٹھنے والیاں اس کے موافق کس طرح ہو سکتی ہیں اس وقت بیوہ عورتوں کا نکاح کرنا قریب قریب بالکل بند ہو گیا تھا۔ جس کو مولانا نے خود کہا ہے۔

"......... ہندوستان میں مسلمانوں نے اہل ہنود کی دیکھا دیکھی یہ بُری رسم اختیار کر لی ہے اور بیوہ کا نکاح کرنا اپنی ذلت اور خاندان کی بدنامی کا باعث سمجھتے ہیں"

"توبۃ النصوح" میں والدین کو تربیت اولاد کے طریقے

بتلائے گئے ہیں ۔ ان کا فرض صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ اولاد کو
پال کر بڑا کردیں اور دنیا کے کاروبار میں بھیجدیں خواہ وہ
دوستوں پڑوسیوں کے علاوہ روزانہ زندگی کے فرائض سے
بالکل ناواقف ہوں لڑکوں کا "استاد اولہ والدین کے احکام کو بالکل
بھولا ہوا ہونا اور مذہب کی طرف سے بالکل بے بہرہ
ہونا" وغیرہ والدین کو مجرم قرار دیتا ہے نہ کہ لڑکے کو۔ کیونکہ
جس طرح وہ اپنے علم اور اپنے اطوار کے مطابق اولاد کی
تربیت کریں گے۔ اس طرح وہ بھی آیندہ اپنی زندگی بسر کریں گے۔ انسان
کی فطرت میں جو بات بچپن میں پڑجاتی ہے وہ عمر بھر رہتی ہے جیسا کہ "توبتہ النصوح"
کے قصہ میں "کلیم" کو دکھلایا گیا ہے اگر اس میں کوئی تبدیلی
چاہے تو وہ بچپن ہی میں ہو سکتی ہے ۔ یہ مثل بالکل صحیح
مشہور ہے کہ " آم کو دیکھ کر آم رنگ پکڑتا ہے" بیشک
اگر بچے کے ماں باپ صوم وصلات کے پابند ہوں اور
وہ اس کو مذہب کی طرف رجوع بھی نہ کریں تب بھی
ان کا بچہ ویسا ہی اُٹھے گا جیسا کہ وہ خود ہیں کیونکہ سوسائٹی
کا اثر انسان پر بہت پڑتا ہے ۔ "سلیم" کا حضرت بی کے
نواسوں سے اثر لینا اور کھیل کود جس کا وہ اس قدر

شوقین تھا ایک دم چھوڑ کر نماز کا پابند ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کو نظر انداز کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو کسی نے مارا نہیں سزا بھی نہیں دی بلکہ صرف ایک مرتبہ کے کہنے سے اور روزانہ ساتھ رہنے سے متاثر ہو کر اُس نے اپنا رویہ بالکل بدل دیا۔

یہ ضرور ہے کہ ان کے بعض ناول عورتوں اور مردوں دونوں کے اخلاق درست کرنے کے لئے لکھے گئے تھے کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ سر سید احمد خاں نے لڑکوں کی تعلیم اور ترقی پر زور دیا تھا اس وجہ سے مولانا نے ان کے خلاف لڑکیوں کی تعلیم پر خاص طور پر توجہ دی اور ان سے حسد رکھنے کی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مولانا نے اپنے ناول "ابن الوقت" میں سر سید احمد خاں ہی کو "ابن الوقت" بنایا تھا۔ مگر در اصل ایسا نہیں ہے اس سے زیادہ اور کوئی کیا ثبوت چاہے گا کہ مولانا نے ایک جگہ پر خود فرمایا ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں خود اپنی زندگی کے کچھ حالات قلمبند کئے ہیں۔ انھوں نے اس زمانہ کی مسلمان عورتوں کو بغور مطالعہ کیا اور اُن کی حالت قابل افسوس پا کر اس طرف توجہ کی اور یہی ان پر الزام

عاید کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی عورتوں کے خاندانی حالات کو نہایت پستی کی حالت میں دکھلایا ہے اب قارئیں خود توجہ فرمائیں کہ یہ الزام کس حد تک درست ہے۔

مولانا شرؔر کے تاریخی ناول بہ نسبت معاشرتی ناولوں کے زیادہ ہیں۔ اُن کے تاریخی ناولوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دور حکومت کے زمانے کی جو غلط فہمیاں عام لوگوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کو دور کیا جائے اور ان کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ زندہ کیا جائے مگر ان کے معاشرتی اور خیالی ناول ہندوستانی سوسائٹی کی برائیاں دور کرنے کے لئے لکھے گئے تھے مثلاً "دلکش" جس میں وہ ان رسموں کو بیان کرتے ہیں جن کی بدولت مسلمان تباہ و برباد ہو رہے ہیں یہی مطلب ان کے دوسرے ناول "آغا صادق کی شادی" کا بھی ہے "بدرالنساء کی مصیبت" میں وہ موجودہ پردہ کی خرابیاں بتلاتے ہیں۔ شرؔر ان کے تاریخی اور معاشرتی ناول سوسائٹی کی اصلاح بھی کرتے ہیں اور اخلاق کی طرف خفیہ طور پہ اشارہ کرتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناول اس کو صاف

صاف ظاہر کرتے ہیں اور قاری کو اخلاق کی طرف زیادہ رجوع ہونے کی ایک طرح سے تنبیہ بھی کر دیتے ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول کسی خاص مقصد کے لئے نہ لکھے گئے تھے۔ ان میں تلاش کرنے کے بعد بہ مشکل کہیں اخلاقی پہلو نکلے گا "فسانہ آزاد" کو لے لیجئے اس کو انھوں نے کسی خاص ارادہ سے تحریر نہیں کیا تھا بلکہ "اودھ اخبار" کے لئے اس کو تحریر کیا کرتے تھے جو مسلسل اس میں شائع ہوتا رہا۔ ایسے قصّے سے پھر کیوں کر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کرے گا۔ اس کے علاوہ ان کے ناول "پی کہاں" "کڑم دھڑم" اور "بچھڑی دلہن" وغیرہ میں بھی اخلاق پر زیادہ زور نہیں دیا گیا یہ ضرور ہے کہ وہ اکثر مقامات پر سوسائٹی کے عیوب اور بربادی کی تصاویر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مگر کبھی مولوی کی طرح وعظ یا لکچر نہیں دیتے بلکہ ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ان کے دور کرنے کی وہ اور کوئی کوشش نہیں کرتے۔

آج کل اگر اردو ادب کے ذخیرے پر نظر ڈالی جائے تو زیادہ تعداد اس میں ایسے ناولوں کی ملے گی جو کچھ تو

مشہور و معروف ناول نگاروں کی تصانیف ہیں ورنہ اور تو ایسے ہیں کہ جس نے چاہا اور جس طرح کا چاہا ناول لکھ دیا ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ناول نگاری کو ایک پیشہ مقرر کر لیا ہے اور اپنی بسر اوقات کے لئے روپیہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے اُن ناول نگاروں کا مقصد تو ظاہر ہو گیا پھر یہ خیال میں کیونکر آسکتا ہے کہ وہ ایسے ناول لکھیں گے جو سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوں نہ کہ مخرب اخلاق ۔ دراصل ان میں نہ کوئی سوسائٹی کی بُرائی دکھلائی جاتی ہے اور نہ اخلاق درست کرنے کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ وہ کیا ہوتے ہیں اور ان میں کیا سبق سکھایا جاتا ہے ؟ جواب اس کا یہ ہے کہ انھیں حسن اور عشق کی داستانیں ہوتی ہیں ۔۔ جن میں کسی شریف لڑکی کا کسی بدمعاش کے ہاتھ سے خراب کیا جانا دکھلایا جاتا ہے ۔ کسی میں لڑکیوں کے بھگانے اور ان کو اپنے فریب میں گرفتار کرنے کے راز بتلائے جاتے ہیں ۔ پنڈت منسا رام شرر لکھنوی نے قیصر باغ کا سچا قصہ دو[2] ناولوں میں یعنی "رام پیاری" اور "شیام پیاری" میں تحریر کیا ہے ۔ میرے خیال میں ان کا اس قصے کے لکھنے کا کوئی مقصد

نہ تھا۔ اس میں اس قدر بیہودہ تصویریں پیش کی گئیں ہیں جن کو انسان ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ بالکل یہی واقعہ مولانا شرر نے بھی اپنے ناول "فلورا فلورنڈا" میں بیان کیا ہے جس میں "فلورنڈا" کی راورق کے ہاتھوں بے عزتی دکھلائی گئی ہے۔ اس میدان میں مولانا موصوف نے اس قدر سنبھال کر قدم رکھا ہے کہ قاری کو کہیں بھی ناگوار نہیں گزرتا گو کہ دونوں میں قریب قریب ایک ہی بات ہے۔ مگر اسلوب بیان میں فرق ہے پھر ایسے ناول اردو ادب کے لئے مایۂ ناز کیونکر ہو سکتے ہیں جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور اگر ہو بھی تو سوسائٹی میں برائیاں بڑھانا اور مخرب اخلاق ہونا۔

مکالمہ مولانا عبدالقادر صاحب "دنیائے افسانہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"حافظ نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنھوں نے مکالموں کو بعینہٖ ظاہر کرنے کی کوشش کی وہ جہاں ایک مارواڑی کو گفتگو کرتے دکھائیں گے تو اس کی زبان بالکل وہی پیش کریں گے جو ایک مارواڑی کی ہوتی ہے۔ اسی طرح پرانی طرز

کے مولویوں کی گفتگو سے مولویانہ شان کا اظہار ہوتا ہے"

اس میں غالباً کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ مولانا نذیر احمد ہی کی سب سے پہلی ہستی ہے جس نے نام بنام مکالمہ اردو ادب میں جاری کیا۔ ان سے پہلے جتنے اردو زبان میں افسانے اور قصے موجود تھے کسی میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا تھا کہ مکالمہ سے کسی کی گفتگو یا واقعات کا اظہار کیا جائے مگر اتنا ہم کو ضرور کہنا پڑتا ہے کہ یہ طرز مولانا نے بھی مرزا اسداللہ خاں غالب سے لیا تھا مولانا نے اس طرز میں تھوڑی سی جدت دکھلائی اور اس کو اردو ادب میں بطور مکالمہ کے جاری کر دیا یعنی یہ کہ انھوں نے اس کو نام بنام لکھنا شروع کیا۔ مرزا غالب نام بنام تحریر نہ کرتے تھے خواجہ الطاف حسین حالی "اردوئے معلیٰ" میں غالب کے لئے یوں تحریر کرتے ہیں۔

"ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال وجواب کرتے ہیں مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ

میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا ۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں ۔ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی تیاری ہو رہی ہے۔"

ان کے مکالمہ کا دوسرا نمونہ ہم ایک خط سے جو انھوں نے "میر مہدی" کے نام لکھا ہے درج کرتے ہیں ۔

"لاحول ولا قوۃ[1] ۔ سنو میر مہدی صاحب میرا کچھ گناہ نہیں ۔ میرے پہلے خط کا جواب لکھو ۔ تپ تو رفع ہوگئی ۔ پیچش کے رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو ۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو ۔ یہ جدی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو عصمت بی بی از بے چادری ہوگا ۔ حالات یہاں کے مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے دیکھو بیٹھے ہیں ۔ کیا جانوں حکیم میر اشرف میں اور ان میں کچھ کونسل ہو تو رہی ہے پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے ۔ اگر چل نکلیں

---

[1] اردوئے معلیٰ

اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھو کہ جناب ملکۂ انگلستان
کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت
ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کیجیو کہ یہ جو فارسی
مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے معنی کیا
ہیں پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک نہ بتائیں۔ اس
وقت پہلے تو آندھی چلی پھر مینہ آیا اب مینہ برس
رہا ہے میں خط لکھ چکا ہوں سرنامہ لکھ کر چھوڑ دوں گا
جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک
کو لیجائے گا۔"

رام بابو سکسینہ صاحب "تاریخ ادب اردو" میں
مرزا غالب کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"...... ان کی تحریریں بالکل باتوں کا
مزہ آتا ہے اور بعض خطوط انھوں نے فی الواقع
مکالمہ کی صورت میں لکھے ہیں کسی میں مکتوب
الیہ کو غائب فرض کر لیا ہے جس سے مکتوب الیہ
کوئی دوسرا شخص معلوم ہونے لگتا ہے۔"

مولانا حالی آگے چل کر تحریر کرتے ہیں کہ مکالمہ کا طرز

اردو ادب میں مرزا موصوف ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ڈرامہ یا ناول کی طرح نام بنام نہ ہو مگر ناول نگاران اردو میں اس کا سہرا مولانا نذیر احمد ہی کے سر رہتا ہے کیونکہ انھوں نے اس کا صحیح مفہوم اور برمحل استعمال سمجھ کر اردو ادب میں جاری کیا ۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے اشخاص قصّہ اپنے آپ کو قاری سے اکثر روشناس کراتے ہیں اور واقعات ناول پر روشنی ڈالتے ہیں ان کے افسانوں کے متعلق ایک "نقاد" کا خیال مولانا عبدالقادر سروری "دنیائے افسانہ" میں یوں درج کرتے ہیں ۔

"ہر افسانہ درحقیقت چند ایسے مباحث کا مجموعہ ہے جو موضوع قصہ کے مختلف پہلو پر ہوسکتے ہیں اور جن کا اظہار مکالمہ کے ذریعہ کیا گیا ہے۔"

(مولانا نذیر احمد اپنے ناولوں میں مکالمہ کو ظاہر کرنے میں بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں مگر جو نقص ان میں رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ مولانا بعض اوقات گفتگو میں متکلم کے سن وسال کا خیال نہیں رکھتے یعنی اس سے خلاف فطرت باتیں بھی کہلوا جاتے ہیں ۔ "توبۃ النصوح" کو

دیکھئے اس میں "حمیدہ" جیسی کمسن لڑکی اور اس کی قدر فلسفیانہ بحث یہ ایسی باتیں ہیں جو اس عمر کے بچّے کے دماغ میں نہیں آسکتیں۔ ان کا مکالمہ قصّے کا جزو بدن معلوم ہونے لگتا ہے یہ ایک ایسا فن ہے جسے ناول نگار قصّہ کو طول دینے کے لئے استعمال کرتا ہے مگر اس میں یہ پہلو مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں گفتگو میں بے مطلب باتیں نہ داخل ہو جائیں۔ مولانا نذیر احمد اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور فضول باتوں سے درگزر کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں یہ طریقہ اختیار کرکے وہ قصّہ کے واقعات اور اشخاص قصّہ پر بخوبی روشنی ڈالتے ہیں ان کے مکالمے نہایت فصیح ہیں اور معلومات کے ذخیرے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔

(یہاں پر ہم "بنات النعش" سے مکالمے کا ایک نمونہ درج کرتے ہیں یہ گفتگو "اصغری خانم" اور "سلطانہ بیگم" کے درمیان ہوئی تھی جب کہ وہ اپنی لڑکی کو مکتب سے رخصت کرانے کی غرض سے اصغری خانم کے پاس آئی تھی "حسن آرا" جو اصغری کے مکتب میں تعلیم پاتی تھی قرآن مجید

ختم کر چکی تھی اس نے اردو کے لکھنے پڑھنے میں کافی مہارت پیدا کر لی تھی۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ مذہبی کتابیں حساب اور چند دیگر کتب بھی پڑھ لی تھیں مگر چونکہ اس کی شادی کے دن نزدیک آرہے تھے اس وجہ سے اس پر مکتب آنے میں روک ٹوک ہونے لگی تھی۔ وہ برابر مکتب آتی جاتی تھی اور ان پابندیوں کا بالکل خیال نہ کرتی تھی جب مایوں بیٹھنے کے تین دن باقی رہ گئے تو "سلطانہ بیگم" مجبور ہو کر اصغری کے پاس آئیں اور اپنے نہ آنے کی معذرت کر کے بیٹھ گئیں۔ اس وقت ان دونوں کی جو گفتگو ہوئی ملاحظہ ہو۔

"اُستانی جی۔ درست ہے یہی تو کام کا وقت ہے آپ نے ناحق تکلیف کی مجھ ہی کو بلا بھیجا ہوتا میں بھی دن رات آپ ہی کے کام میں لگی لپٹی رہتی ہوں۔ جوڑے جو میں نے سیئے اور مصالح ٹانکنے کو آپ سے منگوائے تھے سب تیار ہیں پہلے تو میرا جی ڈرتا تھا کہ جوڑے ماشاءاللہ بہت بھاری ہیں اور خدا کے فضل سے امیر گھر جانے والے ہیں ایسا نہ ہو یہ لڑکیاں کہیں بگاڑ دیں مگر نہیں حسن آرا

بیگم کی محبت سے لڑکیوں نے خوب ہی جی لگا کر سیا اور
مصالحہ بھی بہت ہی صفائی سے ٹانکا اُس جوڑی
گلبدن کے پائجامے میں جو میں نے پرسوں سلوا کر
بھیجا ہے ذرا کلیوں کا گوکھرو کھنچ زیادہ گیا ہے بہتیرا
شہر بانو کہتی رہی کہ استانی جی لاؤ ادھیڑ کر پھر
ٹانک دوں میں نے کہا خیر رہنے بھی دو ادھیڑنے
سے گوکھرو خراب ہو جائے گا۔ آئندہ اس کا خیال
رکھنا۔

سلطانہ بیگم۔ وہ جوڑا میں نے اپنے یہاں کی
مغلانیوں کو دکھایا تھا پھڑک گئیں اور کہنے لگیں پھر
کہاں مردوں کی چٹکی اور کہاں عورتوں کی۔ میں بولی
اری مردوں کا یہاں کیا مذکور۔

مغلانیاں۔ اے حضور یہ جوڑا میاں علی جان
کے کارخانے کا ٹنکا ہوا معلوم ہوتا ہے اسی سے
ٹانکا ایسا درست بیٹھتا چلا گیا ہے تو لونڈیوں کے
عرض کرنے کا یہ مطلب ہے کہ عورتوں کا کام کیسا ہی سجل
کیوں نہ ہو۔ مردوں کے کام کو نہیں پا سکتا۔

میں ۔کہاں کے علی جان اور کیسے مرد ۔یہ جوڑا تو میری اُستانی جی کے مکتب کی لڑکیوں نے سیا اور ان ہی نے اس میں مصالح ٹانکا ہے ۔یہ سن کر مغلانیاں بار بار جوڑے کو کھول کھول کر بغور دیکھتی تھیں اور کہتی تھیں حضور فرماتی ہیں تو ہم کو یقین ہے لیکن عورتوں کے ہاتھ میں یہ صفائی اور یہ ستھرا پن ہم نے تو نہیں دیکھا ۔

اُستانی جی ۔خیر اور جوڑوں کی سلائی مجھ کو بھی پسند ہے پھر آپ نے حسن آرا بیگم کے تمام جوڑے یہیں بھیجدیئے ہوتے ۔لڑکیاں تو خوشی خوشی سی دیتیں

سلطانہ بیگم ۔ اور یہ سارا جہیز کس نے سیا اور کس نے ٹانکا ۔مغلانیوں سے تو میں نے صرف موٹا کام لیا چاندنیاں ہوئیں گٹھڑیاں ہوئیں دسترخوان ہوئے ۔سوزنیاں ہوئیں ۔موباف ۔کستے ۔ غلاف۔ تکئے ۔توشک ۔لحاف ۔اس طرح کی چیزیں البتہ مغلانیوں نے سئی ہیں یا ہاں شب خوابی کے کپڑے۔ باقی پہننے کے کپڑے اکثر تو مکتب میں اور کچھ تھوڑے

باجی اماں کے یہاں سئے پر دئے گئے۔

استانی جی۔ الٰہی خیر سے حسن آرا بیگم کو نصیب ایک بہ ہزاروں اور گھس پس کر پرانے ہوں۔

سلطانہ بیگم۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں اُستانی جی دعا کیجئے اللہ نصیب اچھے کرے بیٹیوں کا بھی کچھ عجب نازک معاملہ ہے کن مصیبتوں سے پالو پرورش کرو اور پھر دھن پرایا کا پرایا۔ کیا کروں کچھ بن نہیں پڑتی ورنہ میں حسنہ کو اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دیتی۔ شہر میں ایک سمدھیانہ کر کے وہ وہ آفتیں اٹھائیں کہ میں نے آگے کو توبہ کی۔ اور کان اینٹھا۔ ورنہ حکیم صاحب بیچارے کا کچھ قصور نہیں کیسی کیسی باتیں حسنا کے واسطے منگوائیں ایک سے ایک بڑھی چڑھی میں نے کہا حاشا ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے گی میں شہر میں اپنی بیٹی نہ دوں گی کالا منہ ایسے شہر کا جس میں یہ کچھ رسوائی اور فضیحت ہے سو استانی جی اب دیہات والوں سے معاملہ کیا ہے خدا کے ہاتھ شرم ہے۔

اُستانی جی۔ حسن آرا بیگم سے آپ مطمئن رہیے اول تو جھجر والے خود بڑے رئیس ہیں دوسرے خاک چاٹ کر کہتی ہوں آپ انشاءاللہ دیکھ لیجیئے گا کہ بیاہ کے دوسرے تیسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم تمام ریاست کے سیاہ و سفید کی مالک نہ بن بیٹھیں تو مجھ کو الٹا الاہنا دیجیئے گا۔ کیا آپ کو حسن آرا بیگم کے مزاج میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

سلطانہ بیگم۔ فرق تو آپ کی عنایت سے زمین آسمان کا ہے آپ کے فیضانِ تعلیم نے خاک کو اکسیر تانبے کو کندن۔ ذرّے کو خورشید۔ پوتھ کو لعل سفید۔ حیوان کو آدم۔ حسنا کو ماشاءاللہ حسن آرا بیگم بنا دیا۔ اس کی خوبیٔ تقدیر کی یہی ایک بڑی نشانی ہے کہ وہ شاگرد اور آپ جیسی اس کی اُستانی ہیں۔ یہ ایسا احسان آپ نے ہم سب گھر والوں پر کیا ہے کہ جب تک جئیں گے آپ کے مرہون منت رہیں گے۔ مگر جب سے حسنا نے بیاہ کی تیاری ہوتے دیکھی ہے کچھ سہم سی گئی ہے یوں ہی گھر میں اُس کا جی نہیں لگتا تھا

اور بھی دل اُچاٹ ہوگیا ہے نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ
کسی سے بولتی اور بات کرتی ہے۔ ارادہ تھا کہ پورے
مہینے بھر مایوں بٹھاؤں گی۔ اس کی حالت دیکھ کر
میں نے کہا کہ مایوں سے بدتر تو یہ خود ہوتی جاتی
ہے رنگت زرد ہوگئی ہے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے
ہیں۔ چہرہ دیکھو اداس۔ صورت دیکھو غمگین۔ میں
کہتی ہوں اس کو اتنی عمر میں فکر کیوں ہے اس عمر
میں تو لڑکیوں کو دلہن بننے کی بڑی خوشی ہوتی ہے۔

استانی جی۔ حسن آرا بیگم اور لڑکیوں کی طرح
نادان نہیں ہیں ماشاءاللہ بڑی فہمیدہ اور زیرک
لڑکی ہے۔ یہی کچھ گھر کے چھوٹنے کا خیال ہوگا۔

سلطانہ بیگم۔ گھر کی تو اس کو مطلق پروا نہیں البتہ
مکتب اس کی جان ہے دیکھئے کیونکر بچی کا دل
بہلے گا۔

اُستانی جی۔ میں سمجھا دوں گی اور یوں آدمی
اپنے پیاروں سے جدا ہوتا ہے تو رنج ہوتا ہی ہے۔

سلطانہ بیگم۔ اتر سوں خیر سے پچیسویں تاریخ

اور جمعہ کا دن ہے اگر آپ اجازت دیں تو حسنا کو مایوں بٹھایا جائے کنبے والے پچھوا پچھوا کر بھیجتے ہیں کہ ابتک لڑکی کو مایوں نہیں بٹھایا۔

استانی جی ۔ خدا مبارک کرے ۔ تاریخ بھی اچھی دن بھی اچھا اور حسن آرا بیگم کو مایوں بٹھانے کی ضرورت تو کچھ نہ تھی ۔ مگر خیر دنیا کی رسم ہے ۔

سلطانہ بیگم ۔ پھر آپ فرمائیں تو حسنا گھر سے نہ نکلے میں تو کئی دن سے کہہ رہی ہوں منہ سے تو کچھ نہیں کہتی آنکھ بچی اور مکتب میں ۔

استانی جی ۔ کل اور معاف کیجئے پرسوں انشاءاللہ میں حسن آرا بیگم کو مکتب سے رخصت کر دوں گی ۔ لڑکیوں کی خواہش ہے کہ کل دونوں وقت مکتب کی طرف سے حسن آرا بیگم کی دعوت ہو رت جگا کریں پرسوں سویرے ذرا آپ بھی "جمال آرا" بیگم کو ساتھ لے کر تشریف لائیے گا ۔ اور لڑکیوں کی ماں بہنیں بھی آئیں گی ۔

اتنی گفتگو کے بعد سلطانہ بیگم رخصت ہوئی۔"

(اس تمام تحریر سے ظاہر ہو گیا کہ اردو ناول نگاری میں مکالمہ کے موجد نذیر احمد ہی ہیں۔ رام بابو سکسینہ صاحب نے مولانا کو اس فن کا اُستاد کامل مانا ہے۔ جب ہم اس بات پر نظر ڈالتے ہیں کہ مکالمہ اردو ناول نگاری میں کہاں تک استعمال کیا گیا اور کہاں تک کامیاب ہوا تو شرر اور سرشار کو بھی ہم کبھی نہیں بھول سکتے یہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے نذیر احمد کے مکالمہ میں چار چاند لگا دئے ہیں انھوں نے بھی مولانا موصوف کے طرز کے علاوہ واقعات کو بیان کرنے میں مولانا نذیر احمد کے خاص انداز کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا ہر ناول اس کا شاہد ہے۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ دونوں مشہور ناول نگار بعض کتب میں دوران مکالمہ میں اصل مضمون سے دور چلے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے مطلب باتیں بھی ان کے ناول میں داخل ہو جاتی ہیں جس سے کسی کیرکٹر یا واقعات ناول پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔)

فلسفہ حیات انسان اگر اپنی زندگی پر نظر ڈالے تو اس کو مختلف پہلو نظر آئیں گے کیونکہ دنیا میں سب سے افضل خطاب اسی ہستی کو ملا ہے یعنی "اشرف

المخلوقات کہلاتا ہے) مولانا نذیر احمد سے پہلے اردو ادب میں جس قدر افسانے لکھے گئے تھے ان میں کہیں دیؤوں اور پریوں کا ذکر ہے کہیں طلسم و سحر کے کرشمے دکھائے گئے ہیں اور کہیں نا ممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ چیزیں انسان کی عملی زندگی میں کیا کام دے سکتی ہیں اور اس نے ان سے کتنا فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر اس کا جواب کچھ ہو سکتا ہے تو یہی کہ وہ تمام باتیں محض تفریح طبع کے لئے تھیں (جب مولانا نذیر احمد نے لکھنے پر قلم اٹھایا تو ان کو غالباً ایک کتاب بھی ایسی نہ ملی تھی جو انسان کو اس کی عملی زندگی سے روشناس کراتی اسلئے انھوں نے یہ خیال کر کے اس شاہراہ سے جدائی اختیار کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ ان تمام پرانی باتوں کو دوبارہ لکھیں اور ان کو اپنے ناول کا موضوع قرار دیں تو وہ اُن سے کسی کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ شاید ہی کوئی شخص اس وقت دنیا میں ایسا ملے گا جس کو دیو اور پریوں سے کام پڑتا ہو چنانچہ انھوں نے اپنے قلم کے رہوار کی باگ اس طرف موڑ دی جس طرف ابھی کسی نے پوری طرح نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہ تھا)

نذیر احمد چونکہ ایک ایسے خاندان سے تھے جن میں دیہات

کی عورتیں زیادہ تھیں جو تعلیم یافتہ کم ہونے کی وجہ سے اپنے
فرائض سے پوری طرح واقف نہ ہوتی تھیں اوران کو خوش اسلوبی
سے انجام دینا ان کو معلوم نہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے اور معمولی
واقعات جو انسان کی تعلیم وتربیت اخلاق وعادات اطوار
اور ڈھنگ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی نظروں میں کچھ
وقعت نہ رکھتے تھے (وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور ایسے
ناول لکھنے پر مجبور ہوئے جوان کو اوران واقعات کی جو بالکل معمولی
ہیں اس کی بزرگی اور اہمیت تبلادیں۔

"...... غور کرنا چاہیئے کہ جس روز سے آدمی پیدا
ہوتاہے زندگی میں مرنے تک اس کو کیا کیا باتیں پیش
آتی ہیں اور کیونکر اس کی حالت بدلا کرتی ہے"

صرف یہی نہیں کہ وہ اتنا لکھ کر خاموش ہوگئے ہوں بلکہ
وہ پہلے بچپن کے زمانے کو لیتے ہیں جب تک بچہ کسی قابل نہیں
ہوتا اور اس کی زندگی کا انحصار اس کے ماں باپ پر ہوتا
ہے مولانا بھی یہ بتلاتے ہیں کہ والدین اس وقت بچہ کے لئے
کیا کیا چاہتے ہیں۔ بچہ کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو، اس کا پیٹ
بھرنے کے لئے وہ اپنے اوپر طرح طرح کی تکالیف برداشت

کرتے ہیں۔ یعنی باپ نوکری۔سوداگری۔گداگری کرکے روپیہ پیدا کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ماؤں کو بھی ماما گری کرنا۔ چکّی پیسنا۔سلائی کا کام کرنا ٹوپیاں وغیرہ کاڑھنا اور چرخہ کاتنا پڑتا ہے یہ تمام ایسے واقعات ہیں جو روزانہ زندگی میں لوگوں کے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ ان کے اوپر یہ واقعات گذرتے رہتے ہیں پھر بچے کا بڑا ہونا اور ماں کا اس کو دودھ نہ پلانا اور طرح طرح سے اس کو گھرکنا اور اس کو گود میں نہ لینا ایک ایسا معاملہ ہے جس کو ہم روزانہ اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں اور نظر انداز کر جاتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور بھی نہیں کرتے کہ آخر ماں کی الفت اور محبت میں یہ تبدیلی کیوں ہوتی جاتی ہے جب کہ وہی ماں ہے جو اس وقت تھی جس وقت بچہ چھوٹا تھا(۔مولانا موصوف کے فلسفہ حیات کو ذہن نشین کرلینے کے لئے مراۃ العروس کی اس عبارت کو پڑھنا نہایت ضروری ہے اور وہ درج ذیل کی جاتی ہے۔

"........ جو آدمی دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا اُس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں ہے

اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہزاروں طرح کی باتیں
ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال
ہے غور کرنا چاہیئے کہ جس روز سے آدمی پیدا ہوتا ہے
زندگی میں مرنے تک اس کو کیا کیا باتیں پیش آتی
ہیں اور کیوں کر اس کی حالت بدلا کرتی ہے۔ انسان
کی زندگی میں سب سے اچھا وقت لڑکپن کا ہے۔
اس عمر میں آدمی کو کسی طرح کی فکر نہیں ہوتی
ماں باپ نہایت شفقت اور محبت سے اُس کو
پالتے ہیں اور جہاں تک بس چلتا ہے اُس کو
آرام دیتے ہیں ۔ اولاد کے اچھا کھانے اچھا پہننے
سے ماں باپ کو خوشی ہوتی ہے ۔ بلکہ ماں باپ
اولاد کے آرام کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اور
رنج گوارا کر لیتے ہیں ۔ مرد جو باپ ہوتے ہیں کوئی
محنت اور مزدوری سے کھاتے ہیں کوئی پیشہ
کرتے ہیں کوئی سوداگری کوئی نوکری غرض جس
طرح بن پڑتا ہے اولاد کی آسائش کے واسطے
روپیہ پیدا کرتے ہیں ۔ عورتیں جو ماں ہوتی ہیں

اگر باپ کی کمائی گھر کے خرچ کو کافی نہیں ہوتی بعض اوقات خود بھی روپیہ پیدا کرنے کے واسطے محنت کیا کرتی ہیں۔ کوئی ماں سلائی سیتی ہے کوئی گوٹا بنتی ہے کوئی ٹوپیاں کاڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مصیبت ماری ماں چرخہ کات کر چکّی پیسکر یا ماماگری کرکے اپنے بچوں کو پالتی ہے۔ اولاد کی محبت جو ماں باپ کو ہوتی ہے ہرگز بناوٹ اور ظاہرداری کی نہیں ہوتی بلکہ سچّی اور دلی محبت ہے اور خدائے تعالیٰ نے جو بڑا داتا ہے اولاد کی یہ ماتا ماں باپ کو اس لئے لگادی ہے کہ اولاد پرورش پائے ابتدائے عمر میں بچّے نہایت بےبس ہوتے ہیں۔ نہ بولتے نہ سمجھتے نہ چلتے نہ پھرتے اگر ماں باپ محبت سے اولاد کو نہ پالتے تو بچّے بھوکے مرجاتے کہاں سے اُن کو روٹی ملتی کہاں سے کپڑا لاتے اور کیونکر بڑے ہوتے۔ آدمی پر کیا موقوف ہے جانوروں میں بھی اولاد کی ماتا بہت سخت ہے۔ مُرغی بچّوں کو کس طرح پالتی

ہے دن بھر اُنکو پروں میں چھپائے بیٹھی رہتی ہے ایک دانہ
اناج کا بھی اس کو ملتا ہے تو آپ نہیں کھاتی بچوں
کو بلاکر چونچ سے اُن کے آگے رکھ دیتی ہے اور اگر
چیل یا بلّی اُس کے بچّوں کو مارنا چاہے تو اپنی جان
کا خیال نہ کرکے لڑنے اور مرنے کو موجود ہوجاتی ہے۔
غرض یہ خاص محبت ماں باپ کو صرف اس لئے
خدا نے دی ہے۔ کہ چھوٹے سے ننّھے بچّوں کو
جو ضرورت ہو اُنکی نہ رہے بھوک کے وقت کھانا
اور پیاس کے وقت پانی سردی سے بچنے کو گرم کپڑا
اور ہر طرح کے آرام کی چیز وقت مناسب پر مل
جائے۔ دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ خاص
محبت اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک بچوں کو
ضرورت اور احتیاج ہوتی ہے۔ جب مرغی کے
بچے بڑے ہوجاتے ہیں تو وہ اُن کو پروں میں چھپانا
چھوڑ دیتی ہے اور جب بچے چل پھر کر اپنا پیٹ آپ بھر لینے کے قابل ہو جاتے
ہیں تو مرغی کچھ بھی اُنکی مدد نہیں کرتی بلکہ جب بہت بڑے ہوجاتے ہیں تو
اُنکو اس طرح مارنے لگتی ہے کہ گویا وہ اُن کی ماں نہیں ہے آدمی

کے ماں باپ کا بھی یہی حال ہے جب تک بچہ بہت
چھوٹا ہے ماں دودھ پلاتی ہے اور اُس کو گود میں
اٹھائے پھرتی ہے اپنی نیند حرام کر کے بچے کو تھپک
تھپک کر سلاتی ہے جب بچہ اتنا سیانا ہوا کہ وہ
کھچڑی کھانے لگا ماں دودھ بالکل چھڑا دیتی ہے
اور وہی دودھ جس کو برسوں پیار سے پلاتی رہی سختی اور
بے رحمی سے نہیں پینے دیتی کڑوی چیزیں لگا لیتی
ہے اور بچہ ضد کرتا ہے تو مارتی ہے گھڑکتی ہے چند
روز کے بعد بچوں کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ گود میں
لینا تک ناگوار ہوتا ہے کیا تم نے اپنے چھوٹے بھائی
بہن کو اس بات پر مار کھاتے نہیں دیکھا کہ ماں
کی گود سے نہیں اُترتے ہیں ماں خفا ہو رہی ہے کہ
کیسا ناہموار بچہ ہے ایک دم کو گود سے نہیں اُترتا
ان باتوں سے یہ مت سمجھو کہ ماں کو محبت نہیں رہی
بلکہ ہر حالت کے ساتھ ایک خاص طرح کی محبت
ہوتی ہے ۔ اولاد کا حال یکساں نہیں رہتا آج دودھ
پیتے ہیں کل کھانے لگے ۔ پھر پاؤں چلنا سیکھا چلتا

بڑا بچہ ہوتا گیا اسی قدر محبت کا رنگ بدلتا گیا لڑکے
اور لڑکیاں پڑھنے اور لکھنے کے واسطے کیسی کیسی
ماریں کھاتے ہیں اگرچہ بیوقوفی سے بچے نہ سمجھیں
لیکن ماں باپ کے ہاتھوں سے جو تکلیف بھی تم کو
پہنچے وہ ضرور تمھارے اپنے فائدے کے واسطے ہے
تم کو دنیا میں ماں باپ سے الگ رہ کر بہت دلوں
جینا پڑے گا کسی کے ماں باپ تمام عمر زندہ نہیں
رہتے خوش نصیب ہیں وہ لڑکے اور لڑکیاں جنھوں
نے ماں باپ کے جیتے جی ایسا ہنر اور ایسا ادب
سیکھا جس سے ان کی تمام زندگی خوشی اور آرام
میں گذری اور نہایت بد قسمت ہے وہ اولاد
جس نے ماں باپ کی زندگی کی قدر نہ کی اور جو
آرام بطفیل والدین اُن کو میسر ہوا اس کو اکارت
کیا اور ایسے اچھے فراغت اور بے فکری کے وقت
کو سستی اور کھیل کود میں ضائع کیا اور عمر بھر رنج
ومصیبت میں کاٹی آپ عذاب میں رہے اور
ماں باپ کو بھی اپنے سبب عذاب میں رکھا ۔

مرنے پر کچھ موقوف نہیں شادی بیاہ ہوئے پیچھے اولاد
ماں باپ سے جیتے جی چھوٹ جاتی ہے جب اولاد
جوان ہوتی ہے ماں باپ بڈھے ہو جاتے ہیں اور خود اولاد کے
محتاج ہو جاتے ہیں پس جوان ہوئے پیچھے اولاد کو ماں باپ سے مدد ملنی
تو درکنار خود ماں باپ کی خدمت اور مدد کرنی
پڑتی ہے لڑکوں اور لڑکیوں کو ضرور سوچنا چاہیے کہ
کہ ماں باپ سے الگ ہوئے پیچھے اُن کی زندگی
کیونکر گذرے گی دنیا میں بہت بھاری بوجھ مردوں
کے سر پر ہے دنیا میں کھانا کپڑا اور روزمرہ کے خرچ
کی سب چیزیں روپیہ سے حاصل ہوتی ہیں اور
یہ سب کھٹراگ روپیہ کا ہے - عورتوں کو بڑی
خوشی کی بات ہے کہ اکثر کمانے اور روپیہ پیدا کرنے
کی محنت سے محفوظ رہتی ہیں دیکھو مرد کیسی کیسی
سخت محنت کرتے ہیں کوئی بھاری بوجھ سر پر
اٹھاتا ہے کوئی لکڑی ڈھوتا ہے - سنار - لہار - ٹھٹھیرا -
کسیرا - کندلہ گر - زرکوب - دبکیہ - تارکش - ملمع ساز -
جڑیا - سلمہ ستارے والا - ٹپیہ - بدرساز - مینا ساز -

قلعی گر۔ سادہ کار۔ صیقل گر۔ آئینہ ساز۔ زردوز۔ منہیارہ
نعلبند۔ نگینہ ساز۔ کامدانی والا۔ سان گر۔ نیارہ یا
ڈھلیا۔ بڑھئی۔ خرادی۔ ناریل والا۔ کنگھی ساز۔
بنس پھوڑ۔ کاغذی۔ جلاہہ۔ رفوگر۔ رنگریز۔ چھیپی۔
درزی۔ دستاربند۔ علاقہ بند۔ پنجہ بند۔ موچی۔ مہرکن۔
سنگتراش۔ حکاک۔ معمار۔ دیگر۔ کمہار۔ حلوائی۔ تیلی۔
تنبولی۔ رنگساز۔ گندھی وغیرہ جتنے پیشہ والے ہیں
سب کے کاموں میں برابر درجے کی تکلیف ہے۔
اور یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے
اور اٹھاتے ہیں لیکن اس بات سے یہ نہیں سمجھنا
چاہیئے کہ عورتوں سے سوائے کھانے اور سو رہنے
کے کوئی کام دنیا کا متعلق نہیں ہے۔ بلکہ خانہ داری
کے تمام کام عورتیں کرتی ہیں مرد اپنی کمائی عورتوں
کے آگے لاکر رکھ دیتے ہیں اور عورتیں اپنی عقل سے
اس کو ایسے بندوبست اور سلیقے کے ساتھ اٹھاتی
ہیں کہ آرام کے سوائے عزت اور نام پر حرف نہیں
آنے پاتا۔ بس اگر غور سے دیکھو تو دنیا کی گاڑی جب تک

ایک پہیہ مرد کا اور دوسرا پہیہ عورت کا نہ ہو چل نہیں سکتی مردوں کو روپیہ کمانے کے بعد اتنا وقت نہیں بچتا کہ اس کو گھر کے چھوٹے کاموں میں صرف کریں اے لڑکو وہ بات سیکھو کہ مرد ہو کر تمھارے کام آئے اور اے لڑکیو وہ ہنر حاصل کرو کہ عورت ہونے پر تم کو اُس سے خوشی اور فائدہ ہو بیشک عورت کو خدا نے مرد کی نسبت کسی قدر کمزور پیدا کیا ہے لیکن ہاتھ پانوں کان۔ آنکھ عقل۔ سمجھ یاد سب مرد کے برابر عورت کو دئے ہیں لڑکے اُنھیں چیزوں سے کام لے کر عالم حافظ حکیم کاریگر دستکار ہر فن میں طاق اور ہر ہنر میں مشاق ہو جاتے ہیں لڑکیاں اپنا وقت گڑیاں کھیلنے اور کہانیاں سننے میں کھوتی ہیں بے ہنر رہتی ہیں اور جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں۔ جیسے نورجہاں بیگم۔ زیب النسا بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکۂ وکٹوریہ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں

سے نے ایک جھوٹے سے گھر اور کنبے کا نہیں بلکہ ملک اور
جہاں کا بندوبست کیا بعض نادان عورتیں خیال کرتی
ہیں کہ بہت پڑھ کر کیا مردوں کی طرح مولوی ہونا
ہے پھر محنت کرنے سے فائدہ لیکن اگر کوئی عورت زیادہ
پڑھ گئی ہے تو بیشک اُس نے زیادہ فائدہ بھی حاصل کیا
ہے اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ زیادہ علم
عورتوں کو پڑھنا ضرور نہیں لیکن جس قدر ضرور ہے
اُس کو کتنی عورتیں حاصل کرتی ہیں کم سے کم اردو
پڑھنا نہایت ضرور ہے اگر اتنا نہیں ہے تو بیشک
ہرج ہوتا ہے یا اپنے گھر کی بات غیروں پر ظاہر
کرنی پڑتی ہے یا اُس کے چھپانے سے نقصان ہوتا
ہے عورتوں کی باتیں اکثر حیا اور پردے کی ہوتی
ہیں لیکن اپنی ماں بہن سے کبھی اُن کو ظاہر کرنے
کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اتفاق سے ماں بہن وقت
پر پاس نہیں ہوتیں ایسی صورت میں یا تو حیا کو
بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے یا نہ کہنے کے سبب نقصان
اٹھانا پڑتا ہے۔ لکھنا بہ نسبت پڑھنے کے کسی قدر

مشکل ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی کتاب سے چار سطریں
روز نقل کیا کرے اور اسی قدر اپنے دل سے بنا کر
لکھا کرے اور اصلاح لیا کرے تو ضرور چند مہینوں
میں وہ لکھنا سیکھ جائیگا خوشخطی سے مطلب نہیں
لکھنا ایک ہنر ہے جو ضرورت کے وقت بہت
کام آتا ہے اگر غلط ہو یا حرف بدصورت ہو اور نادر
لکھے جائیں تو بے دل ہوکر مشق کو موقوف مت
کرو کوئی کام ہو ابتدا میں اچھا نہیں ہوا کرتا اگر
کسی بڑے عالم کو ایک ٹوپی کترنے اور سینے کو دو جس
کو کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا ہو ضرور ٹوپی کو خراب کریگا۔
چلنا پھرنا جو تم کو اب ایسا آسان ہے کہ بے تکلف
دوڑتی پھرتی ہو۔ شاید یاد نہ رہا ہو کہ تم نے کس
مشکل سے سیکھا مگر تمھارے ماں باپ اور بزرگوں
کو بخوبی یاد ہے کہ پہلے تم کو بے سہارے بیٹھنا نہیں
آتا تھا جب تم کو گود سے اُتار کر نیچے بٹھاتے تھے
ایک آدمی پکڑے رہتا تھا یا تکیہ کا سہارا لگا دیتے
تھے پھر تم نے گر پڑکر گھٹنوں چلنا سیکھا پھر کھڑا ہونا

لیکن چارپائی پکڑ کر پھر جب تمھارے پاؤں زیادہ مضبوط ہو گئے رفتہ رفتہ چلنا آگیا مگر صدہا مرتبہ تمھارے چوٹ لگی اور ہر روز تم کو گرتے سُنا اب وہی تم ہو کہ خدا کے فضل سے ماشاء اللہ دوڑی دوڑی پھرتی ہو اسی طرح ایک دن لکھنا بھی آجائے گا اور فرض کرو تم کو لڑکوں کی طرح اچھا لکھنا نہ بھی آیا تاہم بقدر ضرورت تو ضرور آجائیگا اور یہ مشکل تو نہ رہے گی کہ دھوبن کے کپڑوں اور پیسنے والی کی پسائیوں کے واسطے دیوار پر لکیریں کھینچتی پھرو یا کنکر پتھر جوڑ کر رکھو گھر کا حساب کتاب لینا دینا زبانی یاد رکھنا بہت مشکل ہے اور بعض مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ جو روپیہ پیسہ گھر میں دیا کرتے ہیں اس کا حساب پوچھا کرتے ہیں اگر زبانی یاد نہیں ہے تو مرد کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ روپیہ کہاں خرچ ہوا اور آپس میں ناحق کا رنج و فساد پیدا ہوتا ہے اگر عورتیں اتنا لکھنا بھی سیکھ لیا کریں کہ اپنے سمجھنے کے واسطے کافی ہو تو کیسی اچھی بات ہے۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ

سینا پرونا کھانا پکانا یہ دو ہنر ہر ایک لڑکی کو سیکھنے ضرور ہیں کسی آدمی کو یہ حال معلوم نہیں ہے کہ آیندہ اس کو کیا اتفاق پیش آئے گا بڑے امیر اور بڑے دولتمند یکایک غریب اور محتاج ہو جاتے ہیں اگر کوئی ہنر ہاتھوں میں پڑا ہوتا ہے ضرورت کے وقت کام آتا ہے یہ ایک مشہور بات ہے کہ اگلے وقتوں کے بادشاہ باوجود دولت و ثروت کے ضرور کوئی کام سیکھ رکھا کرتے تھے تاکہ مصیبت کے وقت کام آئے یاد رکھو کہ دنیا کی کوئی حالت قابل اعتبار نہیں اگر تم کو اس وقت آرام و فراغت میسر ہے خدا کا شکر کرو کہ اس نے اپنی مہربانی سے ہمارے گھر میں برکت اور فراغت دی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم اس آرام کی قدر نہ کرو یا آیندہ کے واسطے اپنا اطمینان کر لو کہ یہی آرام ہم کو ہمیشہ کے واسطے حاصل رہے گا آرام کے دنوں میں ہا دنوں کا درست رکھنا ضرور ہے۔ اگر تم کو خدا نے نوکر چاکر بھی دے ہوں لیکن تم کو اپنی عادت نہیں بگاڑنی چاہئے شاید

خدانخواستہ یہ مقدور باقی نہ رہے تو یہ عادت بہت تکلیف دیگی۔ آپ اُٹھ کر پانی نہ پینا یا چھوٹے چھوٹے کاموں میں نوکروں یا چھوٹے بھائی بہنوں کو تکلیف دینا اور آپ احدی بن کر بیٹھے رہنا نامناسب بات ہے اور عادت کے بگاڑ کی نشانی ہے تم کو اپنا سب کام آپ کرنا چاہیئے بلکہ اگر تم چست و چالاک رہو تو گھر کے بہت کام تم اُٹھا سکتی ہو اور اگر تم تھوڑی سی محنت بھی اختیار کرو تو اپنی ماں کو بہت مدد اور سہارا لگا سکتی ہو۔ خوب غور کر کے اپنا کام کوئی ایسا مت چھوڑو جس کو ماں اپنے ہاتھوں کرے یا دوسروں کو اس کے واسطے بلاتی اور تکلیف دیتی پھرے۔ اے میری پیاری لڑکی رات کو جب سونے لگو اپنا بچھونا اپنے ہاتھ سے بچھا لیا کرو اور صبح سویرے اُٹھ کر آپ تہ کر کے احتیاط سے مناسب جگہ رکھ دیا کرو اپنے کپڑوں کی گٹھری اپنے اہتمام سے رکھو جب کپڑے بدلنے منظور ہوں اپنے ہاتھ سے پھٹا ادھڑا درست کر لیا کرو میلے کپڑوں کی احتیاط کرو

جب تک دھوبن کپڑے لینے آئے علیحدہ کھونٹی
پر لٹکا رکھو اگر کپڑے بدل کر میلے کچیلے کپڑے اٹھا نہ
رکھو گی شاید چوہے کاٹ ڈالیں یا پڑے پڑے زیادہ
میلے ہوں اور دھوبن اُن کو خوب صاف نہ کر سکے
یا شاید زمین کی نمی اور پسینے کی تری سے اُن میں
دیمک لگ جائے پھر دھوبن کو اپنے میلے کپڑے آپ
دیکھ کر دیا کرو اور جب دھو کر لائے خود دیکھ لیا
کرو شاید کوئی کپڑا کم نہ کر لائی ہو یا کہیں سے پھاڑ
نہ دیا ہو یا کہیں داغ باقی نہ رہ گئے ہوں اس طرح
جب تم اپنے کپڑوں کی خبر رکھو گی تمھارے کپڑے
خوب صاف دھلا کریں گے اور کوئی کپڑا کم نہ ہوگا
جو زیور تم پہنے رہتی ہو بڑے داموں کی چیز ہے شام
کو سونے سے پہلے اور صبح کو جب سو کر اُٹھو خیال
کر لیا کرو کہ سب ہے یا نہیں اکثر بے خبر لڑکیاں کھیل
کود میں زیور گرا دیتی ہیں اور کئی کئی دن کے بعد
اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ بالی گر گئی چھلا نکل پڑا جبکہ
گھر میں کئی مرتبہ جھاڑو دی گئی کیا معلوم ذرا سی

چیز کہاں گئی یا کس جگہ مٹی میں دب گئی تب وہ غافل
لڑکیاں زیور کے واسطے افسوس کرکے روتی ہیں اور
تمام گھر کو جستجو میں حیران کر ڈالتی ہیں۔ اور جب ماں
باپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکی زیور کو احتیاط سے نہیں
رکھتی اور کھو دیتی ہے تو وہ بھی دریغ کرنے لگتے ہیں۔
تم کو ہمیشہ خیال کرنا چاہیئے کہ گھر کے کاموں میں کون
سا کام تمھارے کرنے کا ہے بیشک چھوٹے بہن بھائی
اگر روتے اور ضد کرتے ہیں تو تم ان کو سنبھال سکتی
ہو تاکہ ماں کو تکلیف نہ دیں منھ دھلانا اُن کے کھانے
اور پانی کی خبر رکھنا کپڑا پہنانا یہ سب کام اگر تم چاہو
تو کر سکتی ہو لیکن اگر تم اپنے بھائی بہنوں سے لڑو
اور ضد کرو تو تم خود اپنا وقت کھوتی ہو اور ماں کو تکلیف
دیتی ہو وہ گھر کا کام دیکھے یا تمھارے مقدمے فیصلہ
کیا کرے گھر میں جو کھانا پکتا ہے اُس کو اسی غرض
سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ کب پک چکے گا اور کب
ملے گا گھر میں جو کتے اور بلّی یا دوسر جانور پلے ہیں
وہ اگر پیٹ بھرنے کی امید سے کھانے کے منتظر رہیں تو

مضائقہ نہیں لیکن تم کو ہر بات میں غور کرنا چاہیئے کہ کہ سالن کس طرح بھونا جاتا ہے نمک کس انداز سے ڈالتے ہیں اگر ہر ایک کھانے کو غور سے دیکھا کرو تو یقین ہے کہ چند روز میں تم پکانا سیکھ جاؤگی اور تم کو وہ ہنر آجائے گا جو دنیا کے تمام ہنروں میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز ہے معمولی کھانوں کے علاوہ تکلف کے چند کھانوں کی ترکیب بھی سیکھ لینی چاہیئے آئے گئے کی دعوت میں ہمیشہ طرح طرح سے پر تکلف کھانوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ کباب۔ پلاؤ۔ میٹھے چاول۔ زردہ۔ مطنجن۔ چٹنی۔ مربا۔ فیرینی۔ سب مزہ دار کھانے ہیں ہر ایک کی ترکیب یاد رکھنی چاہیئے بعض کھانے تکلف کے تو نہیں ہوتے لیکن ان کا مزہ دار پکانا تعریف کی بات ہے۔ جیسے کھچڑی کپڑے سینا تو چنداں دشوار نہیں قطع کرنا البتہ عقل کی بات ہے۔ دل لگا کر اس کو معلوم کر لینا بہت ضرور ہے عورتوں کے سب کپڑوں کا قطع کرنا خاص کر ضرور سمجھ لینا چاہیئے اکثر بے وقوف عورتیں اپنے کپڑے

دوسری عورتوں کے پاس قطع کرنے کے واسطے لیئے
لیئے پھرا کرتی ہیں اور اُن کو تھوڑی بات کے لیئے بہت
سی خوشامد کرنی پڑتی ہے مردانے کپڑوں میں انگرکھا
کسی قدر مشکل ہے تم اپنے بھائیوں کے انگرکھے قطع
کیا کرو دو چار انگرکھے قطع کرنے سے سمجھ میں آجائیگا
لڑکیاں شرم کے مارے مُنہ سے نہ کہیں لیکن دل میں
تو ضرور جانتی ہیں کہ کنوارپنے کے تھوڑے دن اور
ہیں آخر بیاہے جائیں گے بیاہے پیچھے بالکل نئی طرح
کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے جیسا کہ تم ماں اور
نانی اور خالہ اور کنبے کی تمام عورتوں کو دیکھتی ہو
کنوارپنے کا وقت بہت تھوڑا وقت ہے اس وقت
کا اکثر حصہ تو بے تمیزی میں گزر جاتا ہے وہ پہاڑ
زندگی تو آگے آ رہی ہے جو طرح طرح کے جھگڑوں
اور انواع و اقسام کے بکھیڑوں سے بھری ہوئی
ہے اب تم غور کرو کہ تم کوئی انوکھی لڑکی تو ہو نہیں
کہ بیاہ پیچھے تم کو کچھ اور بھاگ لگ جائیں گے جو
دنیا جہان کی بہو بیٹیوں کو پیش آتی ہے وہ تم کو بھی

پیش آئے گی پس سوچنا چاہیئے کہ عورتیں کس طرح ا
زندگی بسر کرتی ہیں بیاہے پیچھے کیسی اُن کی عزت
ہوتی ہے مرد کیا ان کی توقیر اور کس طرح اُن کی خاطرداری
کرتے ہیں خاص لوگوں کی حالت پہ تو نظر کرو مت بعض
جگہ اتفاق سے زیادہ ملاپ ہوا عورت مرد پر غالب آگئی
اور جہاں ناموافقت ہوئی عورت کا وقر بالکل اُٹھ گیا
یہ تو بات ہی الگ ہے ملک کے عام دستور اور عام
رواج کو دیکھو سو عام دستور کے موافق ہم تو عورتوں
کی کچھ قدر نہیں دیکھتے ناقصات العقل تو ان کا خطاب
ہے تریاہٹ تریا چرتر مردوں کے زبان زد۔ عورتوں
کے مکر کی مذمت قرآن میں موجود اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ
مرد لوگ عورت کی ذات کو بیوفا جانتے ہیں۔ مصرع

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

ایک شاعر نے عورتوں کی وجہ تسمیہ میں بھی ان کی مذمت
پیدا کی ہے۔ بیت۔

اگر نیک بودے سر انجام زن   زناں راہزن نام بودی نہ زن

یہ سب باتیں تو کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں خانہ داری

کے برتاؤ میں دیکھو تو گھر کی ٹہل خدمت کے علاوہ دنیا
کا کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے لیا جاتا ہے یا کسی عمدہ
کام کی صلاح و مشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں
جن گھروں میں عورتوں کی بڑی عزت اور بڑی خاطرداری
ہے وہاں بھی جب عورتوں سے پوچھا جاتا ہے تو یہی
کیوں بی آج کیا ترکاری پڑے گی لڑکی کے واسطے
ٹاٹ بافی جوتی منگواؤ گی یا ڈیڑھ حاشیے کی ۔ چھالیا
مانک چندی لو گی یا جہازی زردہ پوربی لینا منظور
ہے یا امانت خانی رزائی کو ادوی گوٹ لگے گی یا
پاشرمئی اس کے سوا کوئی عورت بتا دے کہ کبھی
مردوں نے اس سے بڑی باتوں میں صلاح لی
ہے یا کوئی بڑا کام اس کے اختیار میں چھوڑ دیا ہے
پس اے عورتو کیا تم کو اپنے بُرے حالوں جینا
کبھی ناخوش نہیں آتا اپنی بے اعتباری اور بے
وقری پر کبھی افسوس نہیں ہوتا کیا تمھارا جی نہیں
چاہتا کہ مردوں کی نظروں میں تمھاری عزت
ہو اپنے ہاتھوں اپنا وقر کھو رکھا ہے اپنے کارن

نظروں سے گری ہوئی ہو تم کو قابلیت ہو تو مردوں کو کب تک
خیال نہ ہوگا تم کو لیاقت ہو تو مردوں کو کہاں تک پاس
نہ ہوگا مشکل تو یہ ہے کہ تم صرف اسی روٹی دال پکا لینے
اور پھٹا پرانا سی لینے کو لیاقت سمجھتی ہو۔ پھر جیسی لیاقت
ہے ویسی قدر۔ تمھاری اس بالفعل کی حالت پر ایک
بدعقلی اور ایک مکروہ بے وفائی کیا اگر دنیا بھر کے الزام تم پر
لگائے جائیں تو واجب اور دنیا بھر کی برائیاں تم میں نکالی
جائیں تو بجا اے عورتو تم مردوں کے دل کا بہلاؤ اُن کی زندگی
کا سرمایۂ عیش اُن کی آنکھوں کی باغ و بہار اُن کی خوشی
کو زیادہ اور اُن کے غم کو غلط کرنے والیاں ہو اگر تم سے مردوں
کو بڑے کاموں میں مدد ملے اور تم کو بڑے کاموں کے انتظام
کا سلیقہ ہو تو مرد تو تمھارے پاؤں دھو دھو کر پیا کریں اور
تم کو اپنا سرتاج بنا کر رکھیں تم سے بہتر ان کا غمگسار تم
سے بہتر انکا اصلاح کار تم سے بہتر انکا خیر خواہ اور کون ہے لیکن بڑے کاموں کا
سلیقہ تم کو حاصل ہو تو کیونکر ہو گھر کی چاردیواری میں
تم تو قید ہو کسی سے ملنے کی تم نہیں کسی سے بات کرنے
کی تم نہیں عقل ہو یا سلیقہ آدمی سے آدمی سیکھتا ہے مرد لوگ

پڑھ لکھ کر عقل و سلیقہ حاصل کرتے ہیں اور جو لکھے پڑھے
نہیں وہ بھی ہزاروں طرح کے لوگوں سے ملتے ہیں وس سے دس
طرح کی باتیں سنتے ہیں اس پر ویسے تو تم کو نجات کی امید
نہیں ہمارے ملکی دستور اور رواج نے پردہ نشینی کو عورتوں
پر فرض و واجب کر دیا ہے۔ اور اب اس رواج کی پابندی
نہایت ضرور ہے پس سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کیا تدبیر
ہے کہ تمھاری عقلوں کو ترقی ہو بلکہ مردوں کی نسبت عورتوں
کو پڑھنے کی زیادہ ضرورت ہے مرد تو باہر کے چلنے پھرنے
والے ٹھہرے لوگوں سے مل جل کر بھی تجربہ حاصل کر لیں گے
تم گھر میں بیٹھے بیٹھے کیا کرو گی سینے کی بقچی سے عقل کی پڑیا
نکال لو گی یا اناج کی کوٹھری سے تجربے کی جھولی بھر لاؤ گی
پڑھنا سیکھو کہ پردے میں بیٹھے ہوئے تمام دنیا کی سیر کر لیا
کرو علم حاصل کرو کہ اپنے گھر میں زمانے بھر کی باتیں تم
کو معلوم ہوا کریں۔ عورتوں کو اپنی اولاد کی تہذیب کے
واسطے بھی لیاقت حاصل کرنے کی بہت ضرورت ہے۔
لڑکیاں تو بیاہ تک اور لڑکے بھی اکثر دس برس کی عمر
تک گھروں میں تربیت پاتے ہیں اور ماؤں کی خو، بو

اُن میں اثر کر جاتی ہے پس اے عورتو اولاد کی اگلی زندگی تمھارے اختیار میں ہے چاہو تو شروع سے اُن کے دلوں میں وہ ارادے اور وہ اونچے خیال بھر دو کہ یہ بڑے ہو کر نام اور نمود پیدا کریں اور تمام عمر آسایش میں بسر کر کے تمھارے شکر گذار رہیں اور چاہو تو اُن کی اُفتاد کو ایسا بگاڑ دو کہ جوں جوں بڑے ہوں خرابی کے لچھن سیکھتے جائیں اور انجام تک اس ابتدا کا تاسف کیا کریں لڑکوں کو بولنا آیا اور تعلیم پانے کا مادہ حاصل ہوا اگر ماؤں کو لیاقت ہو تو اُسی وقت سے بچوں کو تعلیم کر چلیں مکتب یا مدرسے بھیجنے کے انتظار میں لڑکوں کے کئی برس ضائع جاتے ہیں بہت چھوٹی عمر میں نہ تو خود لڑکوں کو مدرسے جانے کا شوق ہوتا ہے اور نہ ماؤں کی محبت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ ننھے ننھے بچے جو ابھی اپنی ضرورتوں کے ضبط پر قادر نہیں ہیں اُستاد کی قید میں رکھے جائیں لیکن مائیں اگر چاہیں اُسی وقت میں انھیں بہت کچھ لکھا پڑھا دیں لڑکے مدرسے میں بیٹھنے کے بعد بھی مدتوں تک بے دلی سے پڑھا کرتے ہیں اور بہت دنوں میں ان کی استعداد

کو ترقی ہوتی ہے اس تمام وقت میں اُن کو ماؤں سے بہت مدد مل سکتی ہے اول تو ماؤں کی سی شفقت اور دلسوزی کہاں دوسرے رات دن کا برابر پاس رہنا جب ذرا طبیعت متوجہ دیکھی جھٹ کوئی حرف پہچنوا دیا گنتی ہی یاد کرادی کہیں پورب پچھم کا امتیاز بتادیا مائیں تو باتوں باتوں میں وہ سکھا سکتی ہیں جو استاد برسوں کی تعلیم میں بھی نہیں سکھا سکتا اور ماؤں کی تعلیم میں ایک یہ کتنا بڑا لطف ہے کہ لڑکوں کی طبیعت کو وحشت نہیں ہونے پاتی اور شوق کو ترقی ہوتی جاتی ہے اولاد کی تہذیب تو تہذیب اُن کی پرورش کی تدبیر اُن کی جان کی حفاظت ماؤں کے اختیار میں ہے اگر خدا نخواستہ کہیں اس سلیقے میں کمی ہے تو اولاد کی جان پر گزرنے ہے ایسا کون کم بخت ہوگا کہ جس کو ماؤں کی محبت میں کلام ہو لیکن وہی محبت اگر نادانی کے ساتھ برتی جائے تو ممکن ہے کہ بجائے نفع کے اُلٹا نقصان پہنچائے ذرا انصاف کرو کہ کیا ہزاروں جاہل اور کم عقل مائیں ایسی نہیں ہیں جو اولاد کے ہر ایک مرض کو نظر گذر، پرچھانواں اور چھینٹا یا آسیب سمجھ کر بجائے دوا کے جھاڑ پھونک اُتارا

کیا کرتی ہیں اور نامناسب علاج کا اثر تمھیں سمجھ لو کیا
ہونا ہوگا غرض یہ ہے کہ کل خانہ داری کی درستی عقل پر
اور عقل کی درستی علم پر موقوف ہے۔ اب تم کو ایک
لطیف قصہ سناتے ہیں جس سے تم کو معلوم ہوگا کہ بے ہنری
سے کیا تکلیف پہنچتی ہے"۔

بیوہ عورتوں کی شادی نہ کرنا ان کی تکالیف کو بھول جانا اور جس کی
بدولت ان میں بداعمالیاں پیدا ہونا ا چھوتے اور نرالے واقعات
نہیں۔ انسانی زندگی میں جو آپس میں رشتے ہیں ان کا احساس
بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے ان پر بھی انھوں نے کافی زور دیا ہے
یعنی بہن کی بہن سے محبت، ماں باپ کی اولاد سے محبت، استاد
اور شاگرد کے تعلقات، دوستوں اور پڑوسیوں کے فرائض کے
علاوہ عشق کے برے نتائج۔ حسد۔ جلن اور بغض وغیرہ کی اہمیت
بخوبی عیاں کردی ہے صبر اور استقلال کا سبق پڑھایا ہے۔ دوسروں
کی نقل کرنے کے (جو تمام لوگوں کا شیوہ ہے) برے نتائج تبلائے
ہیں غم اور شادی کا مفہوم بخوبی سمجھایا ہے "مرأۃ العروس"
میں اصغری خانم کے پدر بزرگوار نے جو اس کو خط لکھا تھا اس میں
شادی کو اس طرح سمجھایا تھا۔

"........ سمجھنا چاہئے کہ بیاہ کیا چیز ہے ۔ بیاہ
صرف یہی بات نہیں ہے کہ رنگین کپڑے پہنے اور مہمان
جمع ہوئے، مال واسباب وزیور پایا بلکہ بیاہ سے نئی دنیا
شروع ہوتی ہے ۔ نئے لوگوں سے معاملہ کرنا اور نئے گھر
میں رہنا پڑتا ہے جس طرح پہلے پہل بچھڑوں پر جُوا
رکھا جاتا ہے آدمی کے بچھڑوں کا جُوا بیاہ ہے نکاح ہوا
لڑکی بی بی بنی اور لڑکا میاں بنا اس کے یہی معنی ہیں کہ
دونوں کو پکڑ کر دنیا کی گاڑی میں جوت دیا اب یہ گاڑی
قبر کی منزل تک ان کو کھینچنی پڑے گی"۔

(اگر نذیر احمد کے 'فلسفہ حیات' کا حکیم محمد علی خاں کے فلسفہ حیات
سے مقابلہ کیا جائے تو نذیر احمد ہی کا پلہ بھاری نکلے گا ۔ ایک تو موجد
دوسرے اُن تمام واقعات کو لیا جو ہر شخص دیکھتا بھالتا ہے اور
کرتا دھرتا ہے شرر اور محمد علی خاں دونوں بعض اوقات ایسے
واقعات حیات کو لیتے ہیں جو عموماً آدمیوں میں نہیں پائے جاتے
مثلاً شرر کے تاریخی ناولوں میں عام طور پر جنگ کے خوفناک
مناظر بکثرت دکھائے گئے ہیں ۔ ان کے ہیرو فوجوں میں ننگی تلواریں
لیکر گھس جاتے ہیں اور سیکڑوں کا خون کر ڈالتے ہیں اور

پھر بھی صحیح وسالم واپس چلے آتے ہیں اور اختتام ناول پر کامیاب نظر آتے ہیں یہ روزانہ زندگی کے واقعات نہیں کبھی کبھی اگر پیش آجائیں تو کوئی مضائقہ نہیں سرشار ضرور مولانا کے ہم پلہ نظر آتے ہیں کیونکہ انھوں نے ہر ذات کے انسانوں کو الگ الگ صف میں لا کھڑا کیا ہے اور ان کے واقعات زندگی کو صفحہ کاغذ پر اُتار دیا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ نذیر احمد نے مستورات کی طرف توجہ زیادہ دی ہے جس کا ہم پیچھے اعتراف کر آئے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ان کی حمایت بھی کم کی ہے وہ "علامہ راشد الخیری" کی طرح خواتین کی زبان سے "مرد کو جور وستم کا بانی نہیں کہلواتے اگر وہ ان کی حمایت کرتے بھی ہیں تو نہایت سوچ سمجھ کر مولانا حالی کی طرح وہ ان واقعات کو لیتے ہیں جن میں دراصل اُن پر ظلم ہوتا ہے مولانا حالی کی "چپ کی داد" دراصل ایک ایسی چیز ہے جس میں کوئی بات بیجا نہیں اگر وہ اس میں مردوں کو جور و ستم کا بانی ٹھیراتے ہیں تو کوئی خلاف واقعہ نہیں مولانا نذیر احمد نے بھی بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کرنے کی طرفداری کی۔ پہلے مسلمانوں کی سوسائٹی میں بیوہ عورتوں کی شادی کرنا مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اس زمانہ میں یہ رسم

محبوب تصور کیجانے لگی تھی مولانا موصوف کے دل میں یہ بات چبھ گئی اور صرف اتنی سی بات پر انھوں نے اپنا ایک مکمل ناول لکھ ڈالا۔ ان کے انسان سے ایسا انسان مراد ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں مل سکتا ہے یعنی وہ انسان جو غلطیوں کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اُس میں کوئی خامی موجود نہ ہو۔ ایسا اُردو کے اکثر ناول نگاروں نے کیا ہے حتیٰ کہ مولانا شرر بھی اس خامی سے بری نہ رہ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے فلسفہ حیات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے اور یہ ہے بھی ضروری۔ کہ ایک ناول نگار اپنے ناول میں حیات انسانی کے متعلق اپنے خیالات کا بھی اظہار کر دے چنانچہ مولانا کا یہ خیال ہے کہ دنیا چند روزہ ہے اس میں آپس میں کسی طرح کی رنجش نہ پیدا ہونے پائے۔ ایک دوسرے کی رنج و تکلیف کا احساس ہو انسان میں ہمدردی کا مادہ موجود ہو۔ وفاداری اس کا فرض ہو۔ دنیا کی بیہودہ رسموں سے بری ہو۔ معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کو مذہبی زندگی کو بھی جگہ دینی چاہیے۔ اپنے والدین شوہر بیوی۔ بچہ۔ بھائی بہنیں خسر اور اُستاد وغیرہ کی عزت کرنا۔ مصیبت زدوں کو تکلیف میں مدد کرنا لڑائی جھگڑے سے اس

کو دور رہنا چاہئے اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ انسان
بطور مسافر کے آتا ہے اور چند سال گذار کر چلا جاتا ہے پھر وہ
کیوں اپنے آپ کو دنیا کے تمام جھگڑوں میں مبتلا کرے۔ (مراۃ
العروس از صفحہ ۹ تا ۲۳ ملاحظہ ہو) براؤننگ کی طرح ان کا بھی
یہ خیال ہے کہ دراصل انسان کی زندگی موجودہ زندگی کے بعد
شروع ہوتی ہے اور یہ زندگی آنے والی زندگی کی تمہید ہے (
اب تک اردو ادب میں اردو لکھنے کے

اسلوب بیان دو اسالیب بیان موجود تھے ایک تو میر امن
کی سادی اور سلیس عبارت جو عام فہم تھی اور دوسری مرزا
رجب علی بیگ سرور کی رنگین اور مرصع و مسجع عبارت جس
کے سمجھنے کے لئے لغت درکار ہوتی ہے چونکہ مولانا کو اپنے ناول
عام فہم بنانا تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے یہ سادہ طریقہ اختیار
کیا یعنی میر امن کی پیروی کی اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس
کے استعمال میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ محمد یحیی
صاحب تنہا "سیر المصنفین" میں لکھتے ہیں۔

"ان کی تحریر کا انداز خاص تھا الفاظ کی شوکت
عبارت کی متانت طرز ادا کی بلاغت ان کے قلم کی خاص

اور مابہ الامتیاز صفت تھی۔"

غلام محی الدین صاحب مولانا کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد ایل ایل ڈی عربی ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن ان کے اردو کے اسلوب بیان میں کوئی گہرائی نہیں ہے . . . . . حالانکہ انھوں نے متفرق موضوعوں پر قلم اٹھانا چاہا لیکن تنقیدی اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار پر وہ بالکل قادر نہ تھے[۱]"

مولانا نے اپنے ناولوں میں دلی کی عام زبان کو جگہ دی ہے عام زبان سے مرزا غالب کی طرح ان کا بھی مطلب دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان سے ہے اس کے ذریعے سے وہ ہم کو دلی کے شریف گھرانوں کی بول چال اور طرز ادا سے روشناس کراتے ہیں ان کو عام زبان پر بھی بخوبی قدرت حاصل تھی جیسا کہ ان کے ناولوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کو اپنا یہ طرز جو انھوں نے ناولوں میں روا رکھا ہے اس قدر پسند تھا کہ اس کو کہیں بھی جدا کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس کی مثال ان کی اور

---

[۱] اردو کے اسالیب بیان

تصانیف سے مل سکتی ہے ان کے قرآن مجید کے ترجمے کو دیکھ لیجئے۔
اس میں بھی اسی زبان اور طرز تحریر کو روا رکھا ہے۔ ایک خاص
بات جو ہم ان میں پاتے ہیں اور جس کو دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی
ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے دلی اور لکھنؤ اسکول کے اختلافات کا
بالکل خیال نہیں کیا اور دوسرے اردو ادب کے انشا پردازوں
کی طرح اس میں علمی تعصب کو جگہ نہیں دی۔ انھوں نے اپنا
یہ طریقہ بنا رکھا تھا، خواہ لکھنو کی زبان ہو یا دہلی کی کورانہ تقلید
کرنا جائز نہیں، ان کو جو الفاظ لکھنؤ کی زبان میں زیادہ اچھے معلوم
ہوئے ان کو فوراً دلی اسکول کے ان الفاظ کی جگہ استعمال کیا جو
خود وہی معنی دیتے ہیں مگر مفہوم کے ادا کرنے میں تشنہ رہتے ہیں۔
چنانچہ اس کی مثال ان کے کلام اور تصانیف میں بخوبی ملتی ہیں جو
اکثر موقعوں پر ذرا ذرا کے بجائے ''ذری ذری'' کے اسی کو
کا استعمال کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تشبیہات اور اس کے
بہت کم ہیں سادگی اور روزمرہ کے انمول خزانے ان کے ہاں ہے کہ
موجود ہیں جتنی روانی ان کے یہاں موجود ہے بہت کم اردو
ناول نگاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ مولانا غلام محی الدین صاحب
''اردو کے اسالیب بیان'' میں تحریر کرتے ہیں۔

"مولوی نذیر احمد اکثر دفع خیالات کی رو کے ساتھ
اس طرح بہ جاتے ہیں کہ دامن ادب اُن کے ہاتھ
سے چھوٹا پڑتا ہے اور یہی نقص ہے جس کی بنا پر
نہ صرف ادبیت کا فقدان ہو جاتا ہے بلکہ عالمانہ
شان بھی ہاتھ سے جاتی رہتی ہے"

ہر شخص کسی چیز کے متعلق اپنے خیالات رکھتا ہے
اور مولانا غلام محی الدین صاحب کو یہ لکھتے ہوئے پوری
پوری آزادی تھی مگر ایک نقاد کا فرض یہ ہے کہ وہ انصاف
کو کہیں بھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس تنقید میں مولانا
موصوف مولانا نذیر احمد پر ضرورت سے زیادہ سخت
کے مقرر گئے ہیں اس سے ہم کو بھی انکار نہیں کہ وہ جس وقت
کو دلی کے بیٹھتے ہیں تو اپنے خیالات میں اس قدر محو ہوتے
کراتے ہیں درجوش میں اس قدر بھرے ہوتے ہیں کہ کسی بات
جیسا کہ ان کو خیال نہیں ہوتا اور وہ اُن کو نہایت مؤثر طریقے میں
جو اظہار کرنے کے لئے رائج اور متروک دونوں طرح کے الفاظ
کو کہیں کا استعمال کر جاتے ہیں بعض اصحاب تو اس قدر تنگ
نظری سے کام لیتے ہیں کہ ان کو مولانا کی تصانیف میں سوائے

متروک الفاظ کے اور کچھ ملتا ہی نہیں۔ ہم کو اس سے بھی انکار نہیں مگر ان کی تعداد اس قدر کثیر نہیں جتنی کہ بتلائی جاتی ہے (مولانا نذیر احمد نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ جب تک کسی مصنف کی تصانیف موثر نہ ہونگیں تو اوروں کے دلوں پر وہ اثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ میرے خیال میں ان کا یہ خیال صحیح تھا کیونکہ ان کے ناول اس قدر مؤثر ہیں کہ ان کو پڑھکر قاری گھنٹوں اپنے دماغ میں ان کے خیالات اور واقعات کو گھومتا ہوا پاتا ہے۔ اکثر اردو ادب میں ایسے ناول بھی ہیں جن میں اس طرح کے الفاظ موجود نہیں مگر یہ خیال کرنا کہ وہ کس حد تک دلچسپ ہیں بالکل مایوسی میں ڈالدیتا ہے۔

بعض اصحاب کا مولانا نذیر احمد پر یہ اعتراض ہے کہ وہ دلی کے اکثر و بیشتر محاوروں کا استعمال کرتے ہیں جو طبیعت کو بہت جلد پریشان کردیتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ محاوروں کے انمول خزانے ان کے یہاں موجود ہیں۔ مجھ کو یہاں پر ایک سوال پوچھنا ہے کہ اردو زبان کا سرمایہ کن چیزوں سے مل کر تیار ہوا ہے اور کونسی چیزوں کا اس میں بیشتر حصہ ہے؟ غالباً اور تمام باتوں کے ساتھ

اور مابہ الامتیاز صفت تھی۔"
غلام محی الدین صاحب مولانا کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"شمس العلما ڈاکٹر حافظ نذیر احمد ایل ایل ڈی عربی ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن ان کے اردو کے اسلوب بیان میں کوئی گہرائی نہیں ہے ۔۔۔۔ حالانکہ انھوں نے متفرق موضوعوں پر قلم اٹھانا چاہا لیکن تنقیدی اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار پر وہ بالکل قادر نہ تھے۔"[1]

مولانا نے اپنے ناولوں میں دلی کی عام زبان کو جگہ دی ہے عام زبان سے مرزا غالب کی طرح ان کا بھی مطلب دہلی کے شریف گھرانوں کی زبان سے ہے اس کے ذریعے سے وہ ہم کو دلی کے شریف گھرانوں کی بول چال اور طرز ادا سے روشناس کراتے ہیں ان کو عام زبان پر بھی بخوبی قدرت حاصل تھی جیسا کہ ان کے ناولوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کو اپنا یہ طرز جو انھوں نے ناولوں میں روا رکھا ہے اس قدر پسند تھا کہ اس کو کہیں بھی جدا کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس کی مثال ان کی اور

---

[1] اردو کے اسالیب بیان

تصانیف سے مل سکتی ہے ان کے قرآن مجید کے ترجمے کو دیکھ لیجیے۔
اس میں بھی اسی زبان اور طرز تحریر کو روا رکھا ہے۔ ایک خاص
بات جو ہم ان میں پاتے ہیں اور جس کو دیکھ کر بیحد مسرت ہوتی
ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے دلی اور لکھنؤ اسکول کے اختلافات کا
بالکل خیال نہیں کیا اور دوسرے اردو ادب کے انشا پردازوں
کی طرح اس میں علمی تعصب کو جگہ نہیں دی۔ انھوں نے اپنا
یہ طریقہ بنا رکھا تھا، خواہ لکھنو کی زبان ہو یا دہلی کی کورانہ تقلید
کرنا جائز نہیں۔ ان کو جو الفاظ لکھنؤ کی زبان میں زیادہ اچھے معلوم
ہوئے ان کو فوراً دلی اسکول کے ان الفاظ کی جگہ استعمال کیا جو
خود وہی معنی دیتے ہیں مگر مفہوم کے ادا کرنے میں تشنہ رہتے ہیں۔
چنانچہ اس کی مثال ان کے کلام اور تصانیف میں بخوبی ملتی ہیں جو
اکثر موقعوں پر ذرا ذرا کے بجائے "ذری ذری" کے اسی کو
کا استعمال کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تشبیہات اور اس کے
بہت کم ہیں سادگی اور روزمرہ کے انمول خزانے ان کے اہے کہ
موجود ہیں جتنی روانی ان کے یہاں موجود ہے بہت کم اردو
ناول نگاروں کو نصیب ہوئی ہے۔ مولانا غلام محی الدین صاحب
"اردو کے اسالیب بیان" میں تحریر کرتے ہیں۔

"مولوی نذیر احمد اکثر دفعہ خیالات کی رو کے ساتھ
اس طرح بہ جاتے ہیں کہ دامن ادب اُن کے ہاتھ
سے چھوٹا پڑتا ہے اور یہی نقص ہے جس کی بنا پر
نہ صرف ادبیت کا فقدان ہو جاتا ہے بلکہ عالمانہ
شان بھی ہاتھ سے جاتی رہتی ہے"

ہر شخص کسی چیز کے متعلق اپنے خیالات رکھتا ہے
اور مولانا غلام محی الدین صاحب کو یہ لکھتے ہوئے پوری
پوری آزادی تھی مگر ایک نقاد کا فرض یہ ہے کہ وہ انصاف
کو کہیں بھی ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس تنقید میں مولانا
موصوف مولانا نذیر احمد پر ضرورت سے زیادہ سخت
گئے ہیں اس سے ہم کو بھی انکار نہیں کہ وہ جس وقت
بیٹھتے ہیں تو اپنے خیالات میں اس قدر محو ہوتے
در جوش میں اس قدر بھرے ہوتے ہیں کہ کسی بات
کو خیال نہیں ہوتا اور وہ اُن کو نہایت مؤثر طریقے میں
ہر کرنے کے لئے رائج اور متروک دونوں طرح کے الفاظ
کا استعمال کر جاتے ہیں بعض اصحاب تو اس قدر تنگ
نظری سے کام لیتے ہیں کہ ان کو مولانا کی تصانیف میں سوائے

متروک الفاظ کے اور کچھ ملتا ہی نہیں۔ ہم کو اس سے بھی انکار نہیں مگر ان کی تعداد اس قدر کثیر نہیں جتنی کہ بتلائی جاتی ہے (مولانا نذیر احمد نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ جب تک کسی مصنف کی تصانیف موثر نہ ہونگیں تو اوروں کے دلوں پر وہ اثر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ میرے خیال میں ان کا یہ خیال صحیح تھا کیونکہ ان کے ناول اس قدر مؤثر ہیں کہ ان کو پڑھکر قاری گھنٹوں اپنے دماغ میں ان کے خیالات اور واقعات کو گھومتا ہوا پاتا ہے۔ اکثر اردو ادب میں ایسے ناول بھی ہیں جن میں اس طرح کے الفاظ موجود نہیں مگر یہ خیال کرنا کہ وہ کس حد تک دلچسپ ہیں بالکل مایوسی میں ڈالدیتا ہے۔

بعض اصحاب کا مولانا نذیر احمد پر یہ اعتراض ہے کہ وہ دلّی کے اکثر و بیشتر محاوروں کا استعمال کرتے ہیں جو طبیعت کو بہت جلد پریشان کر دیتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ محاوروں کے انمول خزانے ان کے یہاں موجود ہیں۔ مجھ کو یہاں پر ایک سوال پوچھنا ہے کہ اردو زبان کا سرمایہ کن چیزوں سے مل کر تیار ہوا ہے اور کونسی چیزوں کا اس میں بیشتر حصّہ ہے؟ غالبًا اور تمام باتوں کے ساتھ

ساتھ یہ بھی کہا جائے گا کہ محاورات بھی اس کا ایک ضروری جزو ہیں۔ پھر جب ایک شخص نہایت موزوں اور عمدہ محاورات ایجاد کرے اور ان کا صحیح اور برمحل استعمال کرے تو اس کا مجرم کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُسکے یہاں محاورات کی بھرمار ہے۔ کیا "مولانا محمد حسین آزاد" کے یہاں محاورات موجود نہیں ؟ کیا سرشار لکھنئو کے محاورات کا استعمال نہیں کرتے ؟ اردو ادب میں محاورات اور ضرب المثل ایسی چیزیں ہیں جو اس کے سرمایہ کو بڑھاتی ہیں۔ اگر انھوں نے دوسری زبان کی اُن چیزوں کو داخل کر دیا تو ہم کو فخر کرنا چاہیئے نہ یہ کہ ان کو عیوب میں شمار کرکے مولانا کو اس کا مجرم ٹھہرائیں۔ مولانا غلام محی الدین صاحب مولانا کے یہ نقص "اردو کے اسالیب بیان" میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ان کی عبارتوں سے ان کی قابلیت اور تحقیق کا کوئی پتہ نہیں چلتا اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ نہایت سنجیدہ اور ثقہ بحث میں بھی وہ مذاقی اور عامیانہ اسلوب بیان استعمال کرتے ہیں مثلاً "الحقوق و الفرائض" کو وہ اس طرح شروع

کرتے ہیں"

"کسی نے کیا چچی تلی ہوئی یا دن[۵۲] تولے پاڈ لتی بات کہی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ عَرَفَ رَبَّهٗ" اسی طرح "اجتہاد" کے چند جملے ملاحظہ ہوں"

"اسی اثنا میں اتفاق سے مجھ کو تپ آنے لگی اور مسہلوں تک نوبت پہنچی علالت کی حالت میں مجھ کو یہ خیال ہوا کہ اگر میں اس بیماری کی حالت میں مر گیا تو کتے کی موت مرا۔ تم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو گدہی کمہار کی تجھے رام سے کو ہتو۔ کہاں راجہ بھوج کہاں بجھوا تیلی ؟"

یہ ہیں وہ اعتراضات جو مولانا غلام محی الدین صاحب مولانا پر کرتے ہیں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اعتراضات کس حد تک صحیح ہیں کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو اُن کی عبارت میں جان ڈال دیتی ہیں اور اُس کو مزے دار اور عام فہم بنا دیتی ہیں۔

رام بابو سکسینہ صاحب لکھتے ہیں۔

"مولوی نذیر احمد صاحب صرف روانی چاہتے

---

۵۱ تاریخ ادب اردو۔

سے اور بے تکلفی میں اس قدر حد سے بڑھ گئے ہیں
کہ زبان کو جب متین بنانا چاہتے ہیں تو سوائے اس کے کہ
عربی یا انگریزی جملے اور لغات داخل کردیں۔ ان کا
کچھ زور نہیں چلتا۔ بندش وہی رہتی ہے اور عبارت
بھی وہی باقی رہتی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو روانی اُن کے یہاں
ہے بہت کم نثاران اُردو کو نصیب ہوئی ہے بے تکلفی
اُن کی تصانیف کا جوہر اصلی ہے) کیونکہ انگریزی ناول
نگار "چارلس لیمپ" کی طرح وہ یہ طریقہ اختیار کر لیتے
ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کے ساتھ اُن کی
قدیمی دوستی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سکینہ صاحب اُن کا
عربی اور انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا ایک حامی کی نظر سے دیکھیں
مگر اس سے ان کی عربی اور انگریزی کی قابلیت کا اظہار ہوتا
ہے جس کا اعتراف اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔

(طرز ادا بالکل نیچرل ہے تصنع کا کہیں ذکر نہیں جتنی کتابیں
مولانا کی تصانیف میں شمار کی جاتی ہیں اس قدر سادہ اور
عام فہم ہیں کہ ایک معمولی سے معمولی پڑھا لکھا انسان کافی طور

سے سمجھ سکتا ہے مکالمہ کو بھی نہایت موزوں مقام پر استعمال کیا ہے جس کے اوپر ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ جناب کمیپن صاحب بہادر "مراۃ العروس" کے ریویو میں لکھتے ہیں۔

"......۵۲ عبارت اور طرز بیان کے لحاظ سے زبان اُردو کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے کتاب مذکور اس باب میں مرزا نوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے اور فی الواقع الف لیلہ اور بدرالدین خاں دہلوی کے "بوستان خیال" کی اردو کے ہم پلہ ہے۔"

(اس پر غالباً سب کو اتفاق ہو گا کہ اس کی عبارت سادہ اور طرز بیان بالکل روزمرہ کی بول چال کی طرح ہے) مگر صاحب بہادر کا مولانا نذیر احمد کی اردو کا مقابلہ مرزا غالب کی اردوئے معلّٰی سے کرنا درست نہیں۔ مرزا غالب ہی اس طرز کے موجد تھے اور مولانا نے زیادہ تر ان کی تقلید بھی کی یعنی دلّی کے شریف گھرانوں کی زبان استعمال کی (محاورات اور الفاظ بھی ویسے ہی استعمال کیئے پھر جب کوئی شخص کسی چیز کا موجد ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ اس میں کامل بھی ہو۔ اس کو ابتدائی دور

میں ہمیشہ دقتیں پیش آتی ہیں جو اس کے بعد کے انشا پرداز حل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا کی زبان اور اردو کا مقابلہ مرزا غالب سے نہیں کیا جا سکتا۔ رہی "الف لیلہ" اور "بوستان خیال" اگر مولانا نذیر احمد کی تصانیف کی اردو ان دونوں کتابوں سے بہتر ہے تو کون سی نرالی بات ہے مولانا کے زمانے میں اردو کافی ترقی کر چکی تھی اور "الف لیلہ" اور "بوستان خیال" کی تصانیف کے زمانے میں اردو اس قدر ترقی نہیں کرنے پائی تھی پھر جب اردو کے ارتقا میں وقت کا اس قدر فرق ہو تو مقابلہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ان کی عبارت فصیح ہونے کے علاوہ مؤثر بھی ہے بعض اوقات ان کی تحریریں اس قدر اثر ہوتا ہے کہ قاری کو اُن کے جذبات اور احساسات کا یقین کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مولانا غلام محی الدین صاحب لکھتے ہیں۔

[1] وہ (مولانا نذیر احمد) قصہ بیان کرتے کرتے کسی معاملہ میں ضمناً انسان اور فطرت کے متعلق اس جوش اور ادبیت کے ساتھ خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اُن

---

[1] اردو کے اسالیب بیان

کے جملے تیر کی طرح دل میں اُترنے لگتے ہیں اور ... بانہ" ہے ۔
ہے کہ انھیں زبانی یاد کر لیا جائے"
... ر ایک
اکثر موقعوں پر انھوں نے اپنی عبارت میں مصوری د ... اور
دکھایا ہے جہاں جس چیز کو بیان کیا ہے اس کا مکمل نقشہ
آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ دراصل غلام محی الدین صاحب
کا یہ کہنا درست ہے کہ چند جگہوں پر اُن کی عبارت کو پڑھ کر
طبیعت چاہتی ہے کہ اس کو ضرور یاد کر لیا جائے۔
(علّامہ راشد الخیری کی طرف رجوع ہونے سے معلوم ہوتا ہے
کہ انھوں نے مولانا کی پوری پوری تقلید کی ہے کیونکہ جب ہم ان دونوں
ہستیوں کا موازنہ کرتے ہیں تو سوائے اس کے اور کوئی فرق
نہیں معلوم ہوتا کہ علّامہ موصوف نے اپنے طرز کو مولانا نذیر احمد
کے طرز سے زیادہ دردناک اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے
اور وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ ان کو "مصورِ غم" کہا جاتا ہے۔ مولانا نذیر احمد جب ایک
چیز کو بیان کرتے ہیں تو اسی طرح کی متعدد چیزیں گنا جاتے
ہیں اور اُن کے بیان کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ جملہ میں کہیں
بھی ناہمواری نہیں معلوم ہوتی) اگر مولانا پیشے بیان کرتے ہیں

طرح نبھاتے ہیں گویا ان کو اس کے لکھنے میں
نہیں ہوئی بالکل یہی طریقہ علامہ راشد الخیری نے
ینار کر رکھا ہے۔

شرر کا اسلوب بیان کسی حد تک اپنے اندر عجوبہ پن رکھتا
ہے انھوں نے بھی میر امن کی "سادگی عبارت" پر عمل کیا ہے
مگر ایک جدت کے ساتھ مولانا نذیر احمد نے بھی اس میدان
میں قدم بڑھایا تھا مگر پوری پوری کامیابی حاصل نہ کر سکے
جناب رام بابو سکسینہ صاحب نے بھی مولانا کے اس طرز بیان
کی خامی کو تبلایا ہے اس ناکامیابی کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا
انگریزی زبان سے بہت زیادہ واقفیت نہ رکھتے تھے مولانا
نذیر احمد کے تتبع میں مولانا شرر نے بھی انگریزی زبان
کی بندشین اردو ادب میں داخل کیں مگر تشبیہات اور استعارات
کو بالکل تبدیل نہیں کیا اُن کے ناول قدیم پامال اور
فرسودہ تشبیہات کے حامل ہیں۔ سرشار کے ناول دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نذیر احمد کی طرح اُن کے ناول بھی
لکھنو کے محاورات اور الفاظ کے بیش بہا خزانے ہیں پنڈت
جی کے طرز بیان میں جو نقص تبلایا گیا ہے وہ وہی ہے جس کے

مولانا نذیر احمد شکار ہوئے ہیں یعنی یہ کہ وہ "عامیانہ" ہے۔
خیر یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ تاہم انھوں نے اپنے اندر ایک
خصوصیت کو رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ لکھنؤ کی ٹھیک اور
روزمرہ زبان بولتے ہیں مولانا نذیر احمد کی طرح اُن کے ناول بھی ہم
کو لکھنؤ کی بیگمات کی زبان بتلاتے ہیں جس طرح نذیر احمد اکثر
موقعوں پر غلط الفاظ اور محاورات استعمال کر گئے ہیں اسی طرح
سرشار نے بھی کیا ہے مگر وہ اس قدر کم ہیں کہ اگر ان کو نظر انداز کر دیا جائے
تو بہتر ہے۔ "پنڈت بشن نراین" آنجہانی "فسانہ آزاد" کے اس
بیان کے لئے یوں رقمطراز ہیں۔

"....... عبارت آرائی غضب کی ہے طرزِ ادا
نہایت بے تکلف اور آسان تازہ نیچرل تمثیلی اور
واضح پھیر اس کے ساتھ جابجا پر لطف ظرافت۔ پھڑکتے
ہوئے فقرے۔ مزے دار شوخیاں۔ ترکی بہ ترکی جواب
حماقت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے
پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔"

(شرر۔ سرشار اور مولوی نذیر احمد کو چھوڑ کر نیاز فتحپوری نے
اس میدان میں اور کامیابی حاصل کی ہے مگر جب ہم رام بابو سکسینہ

کی وہ تحریر پڑھتے ہیں جس میں انھوں نے سرشار کے اسلوب کے متعلق تحریر کیا ہے تو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کیا بات ایسی پائی جس نے سرشار کو اس قدر پستی میں ڈال دیا۔ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"پنڈت رتن ناتھ میں کوئی ایجادی مادہ نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اتنا کہ اُن میں ظرافت کا مادہ بڑھا ہوا ہے اُن کی عبارت دو طرح کی رہتی ہے ایک تو وہ جہاں وہ خود کوئی سماں کھینچنا چاہتے ہیں یا کسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں اُن کی عبارت میں اور سرور کی عبارت میں کوئی فرق نہیں وہی قافیہ پیمائی ہے۔ وہی مبالغے ہیں۔ وہی پرانی تشبیہات و استعارات ہیں اور وہی جا بجا اور ضرورت بے ضرورت اشعار کا بھرتی کرنا ہے بلکہ الفاظ بھی۔ وہی پرانے فارسی شاعروں کے ہیں دوسری وہ عبارت جہاں عورتوں کی زبان سے وہ اُن کے خیالات ادا کراتے ہیں۔ اس میں سوائے خاص خاص لغزشوں[۱]

---

[۱] تاریخ ادب اردو۔

کے وہ لکھنوئی عورتوں کی زبان اچھی اور بے تکلف لکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ سرشار کی زبان میں کوئی جدت نہ تھی سوائے اس کے کہ خلاف قیاس مضامین کو چھوڑ دیا پرانی عبارت اور اُن کی عبارت میں کوئی فرق نہ تھا۔"×

واقعات اور مولانا کے ناول

پرانے افسانوں اور موجودہ زمانہ کے ناولوں میں جو فرق ہے وہ زیادہ تر واقعات کا ہے۔ مولانا نذیر احمد کے ناولوں میں واقعات دو طرح سے لئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ پہلے اشخاص قصہ لے لئے اور اُن کے کردار کے مطابق واقعات کو جگہ دی اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انھوں نے واقعات پہلے جمع کر لئے اور اُن کے مطابق اشخاص قصہ منتخب کر لئے۔ مولانا کے ناولوں کے طبع ہونے سے پہلے جو افسانے موجود تھے وہ ایسے واقعات سے پر تھے جو انسان کی عملی زندگی سے زیادہ تعلق نہ رکھتے تھے یعنی وہی جو ہم پیچھے کہہ آئیں ہیں کہ انسان کی دیووں سے لڑائی۔ پریوں سے ملاقات، کاموں کا جاندار اور بے جان چیزوں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچنا وغیرہ وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو انسان کی زندگی میں بالکل بے کار اور

بے سود ہیں آج کل نہ انسانوں کو پریوں سے کام پڑتا ہے نہ اُن کی دیودں سے لڑائیاں ہوتی ہیں پھر ایسے واقعات کا لکھنا جن کی کچھ بنیاد ہی نہیں محض بے کار ہی نہیں بلکہ نقصان دہ ہے پرانے افسانے اسی طرح سے لکھے گئے ایک مصنف نے ایک طرح کے واقعات کو قلمبند کیا دوسرے نے اُن میں معمولی تبدیلی کرکے اپنا افسانہ لکھ لیا لیکن نذیر احمد ان لوگوں میں نہ تھے جو داستان امیر حمزہ اور سرور کے "فسانہ عجائب" کی تقلید کرتے۔ انھوں نے حقیقت کی طرف قدم بڑھایا اور ایسے واقعات کو اپنے ناولوں میں درج کیا۔ جو انسان کی زندگی کے نہایت ضروری شعبوں پر پوری طرح سے روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے لئے نتیجہ میں فائدہ مند ہوتے ہیں۔

فی زمانا جدید رنگ، قدیم رنگ پر غالب ہے۔ اطوار زندگی تبدیل ہو گئے ہیں لوگوں کی سوسائٹی میں بھی تبدیلی ہو گئی ہے اور مذاق بھی بالکل بدل گئے ہیں اب لوگوں کو ان باتوں کے پڑھنے میں بالکل لطف نہیں آتا جس کو پرانے زمانے والے چٹخارے مار مار کر اور مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے آج کل ایسے ناول جلد مقبول خاص و عام ہوتے ہیں۔

جو عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں آجکل ایک ناول نگار کے مشہور ہونے کا یہی ایک عمدہ ذریعہ بھی ہے۔ مولانا نذیر احمد عورتوں اور مردوں دونوں میں بہت زیادہ مقبول ہیں اس کی صداقت کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ اگر مستورات سے یہ پوچھا جائے کہ مولوی نذیر احمد کون تھے؟ تو غالباً جواب نہ ملے مگر جب اُن سے یہ کہا جاتا ہے کہ "اصغری و اکبری" والے کون تھے اور کہاں کے رہنے والے تھے تو غالباً کوئی منھ ایسا نہ ملے گا جو بند رہ سکے۔ سب سے یہی صدا آئے گی کہ ہم جانتے ہیں آخر یہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ناول عام فہم ہونے کے علاوہ اُن کی زندگی کا پورا پورا نمونہ ہیں۔

واقعات کی صداقت دراصل ایک ایسی چیز ہے جس میں بعض اوقات مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی دھوکا کھایا ہے۔ وہ اکثر اپنے تاریخی ناولوں میں بے تعلق اور غلط واقعات کو صحیح سمجھ کر بیان کر گئے ہیں، جس سے قصہ کی صداقت پر بھی اثر پڑتا ہے۔ مولانا نذیر احمد بھی اس خامی سے بری نہیں بلکہ میرے خیال میں ان کی اس خامی نے اُن کے ناولوں میں چار چاند اور لگائے ہیں کیونکہ صداقت واقعات اُن کے ناولوں کی ہر دلعزیزی ت

بخوبی ظاہر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نے "مراۃ العروس" میں اپنی ایک لڑکی کا سچا قصہ بیان کیا ہے۔ مگر اس کی مولانا نے خود تردید کی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس کی صداقت پر اس قدر بھروسہ ہے کہ وہ دہلی جاکر "اصغری و اکبری" کا مکان ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ در اصل یہ ایک فرضی قصہ ہے اس کے علاوہ "ابن الوقت" کو دیکھئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا نے اس کو سرسید مرحوم کے اوپر لکھا تھا مگر مولانا نے خود فرمایا ہے کہ وہ خود ان کی زندگی کا ایک ورق ہے ان کے ناولوں کے واقعات عموماً ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں تاکہ قاری کو ان کی اچھائی اور برائی واضح طور پر معلوم ہو جائے اس طرح ان کے ناول کا ایک واقعہ دوسرے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگر گناہ کو سمجھانا چاہتے ہیں تو اس کے مقابل ثواب کو لاکر کھڑا کرتے ہیں۔ نیکی دوستی محبت اور سلیقہ کے خلاف بدی۔ دشمنی۔ جلن اور بدتہذیبی کو پیش کرتے ہیں غرض ان کے یہاں ایسے واقعات کو دخل ہے جو خود بخود بولتے ہیں۔ اس خصوصیت میں مولانا کے مقابل مولانا عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار بھی نظر نہیں آتے۔ مولانا

عبدالقادر صاحب "دنیائے افسانہ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"ناول میں خود مصنف کو نہیں بلکہ واقعات کو گویا ہونا چاہیئے یہ کام حافظ نذیر احمد نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا ہے اس کی مثالیں اردو افسانہ نگاری میں بہت کم ملتی ہیں۔ مثلاً "توبۃ النصوح" کو دیکھیے کلیم جب دولت آباد جاتا ہے تو مولویوں سے اُس کی ملاقات ہوتی ہے۔ کلیم کے ساتھ ان کی گفتگو مولویوں کی تمثیلی گفتگو کا نمونہ ہے موٹے موٹے عربی کے لغات پر حرف کو مخرج کے ساتھ ادا کرنا۔ منطق کے قصے غرض تمام چیزیں ایسے بے تکلفانہ انداز میں نکل پڑتی ہیں کہ یا لکل فطری معلوم ہوتی ہیں درحالیکہ مصنف نے ایک لفظ بھی اُن کی گفتگو یا ملاقات کی توضیح کے متعلق نہیں کہا ہے۔"

انھوں نے بھی مولانا شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی طرح جن واقعات کو لیا ہمیشہ پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا یعنی وہ اگر بیوہ کی شادی کا قصہ پیش کرتے ہیں اور اس کے حامی ہوتے ہیں تو بے شمار دلائل سے اسکو ثابت کرتے ہیں۔

(ان کا یہ شیوہ نہیں رہا کہ اگر کوئی شخص قصہ اس کے خلاف ہوا تو وہ اُس کو فوراً تبدیل کر دیں وہ تو اُس کو بھی شکست دے کر برسرِ مطلب آجاتے ہیں۔ بچوں کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ اُن کی خانگی اور طالبعلمانہ زندگی کے علاوہ جوانی کے احالات اور اُس وقت کی بے عنوانیوں کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے دنیا کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا) ان کو مولانا شررؔ اور دیگر ناول نگاران اردو پر اس معاملے میں بھی فضیلت حاصل ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ دلائل پر منحصر ہوتا ہے اور اس کارد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا بعض اصحاب کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جب کوئی نثار یا ناول نگار ایک واقعہ کو بار بار لکھتا ہے تو اس میں کوئی عجوبہ پن نظر نہیں آتا کیونکہ وہ مختلف طریقوں سے ایک بات کو دہراتا ہے۔ مولانا نے اُن لوگوں کے اس خیال کو بالکل غلط ثابت کر دیا آپ نے ایک واقعہ کو سیکڑوں طرح سے لکھا ہے اور ہر مرتبہ اس میں ایک نئی شان پیدا کر دی ہے شررؔ اور سرشارؔ کا بھی اس معاملے میں یہی حال ہے جو مولانا نذیر احمد کا دراصل انھوں نے میلی ناکس کے اس مقولے کو بالکل صحیح ثابت

کر دیا ہے۔

"بہترین[1] شے ہر وقت نئی معلوم ہوتی ہے۔"

(مولانا نذیر احمد کے ناولوں کے واقعات نہایت منظم طور پر بیان کئے گئے ہیں مگر سرشار کے "فسانۂ آزاد" میں یہ بات موجود نہیں) ہم پیچھے رام بابو سکسینہ صاحب کی رائے درج کر آئے ہیں جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "فسانۂ آزاد" کا اصل قصہ کچھ اور ہے اور واقعات کچھ اور ہیں ان سے نہ اصل قصہ پر روشنی پڑتی ہے اور نہ کیرکٹروں کے ارتقا ہی میں کچھ مدد ملتی ہے کسی ایک واقعہ کو دوسرے سے کچھ تعلق نہیں۔ ان کے تمام واقعات محض ایک کھونٹی پر ٹنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مبالغہ اور واقعات ناول

(ہر چیز کی دنیا میں کوئی نہ کوئی حد ضرور ہوتی ہے اس لئے ناول بھی اس سے بری نہیں اس کے ہر جزو کے لئے ایک حد مقرر ہے ان میں سے ایک مبالغہ بھی ہے جو قریب قریب ہر ناول میں پایا جاتا ہے یہ بھی درست ہے کہ بغیر مبالغہ کے ناول کا دلچسپ بنانا بہت مشکل ہے یعنی اس کا

---

[1] دنیائے افسانہ

استعمال کرنا نہایت ضروری ہے۔ پرانے افسانہ نگاروں کے افسانے "غلو" کا شکار ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی دلکشی میں فرق آگیا ہے۔ ان کو چاہئے تھا کہ وہ مبالغہ کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرتے مولانا نذیر احمد کے ناول اس غلطی سے محفوظ ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں مبالغہ مفقود ہے۔ مبالغہ ہے اور ضرور ہے۔ مگر انھوں نے اس کو اعتدال پر قائم رکھا ہے ان کے اکثر ناول فرضی ہیں انھوں نے مبالغہ کو اس طرح جگہ دی ہے کہ وہ حقیقت نا معلوم ہونے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو ان کے ناولوں کو پڑھتے ہیں فوراً یہ خیال نہیں کر لیتے کہ یہ سب فرضی ہیں بلکہ ان قصوں کو بعض لوگ ان کی صداقت پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اشخاص قصہ ضرور گذرے ہیں اس کی وجہ سب کو معلوم ہے کہ غیر فطری واقعات کو وہ اپنے ناول میں جگہ نہیں دیتے اس معاملے میں مولانا کو مولوی عبد الحلیم شرر پنڈت رتن ناتھ سرشار حکیم محمد علی خاں اور مولانا نیاز فتحپوری پر بھی فوقیت حاصل ہے مولانا شرر نے مبالغہ کو ضرورت سے زیادہ استعمال کیا ہے ان کے تاریخی ناولوں میں یہ اکثر پایا جاتا ہے کہ ہیرو ترک اور جنگل میں تن تنہا ایک فوج کا مقابلہ کرتا ہے اور اس فوج کو مار کر بھگا دیتا ہے

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خود فوج میں گھس جاتا ہے اور سیکڑوں کو مار کر صحیح و سالم واپس چلا آتا ہے سرشار نے بھی ایسی غلطی کی ہے "فسانہ آزاد" میں بھی مبالغہ در اصل ضرورت سے زیادہ ہے خوجی کو لے لیجئے آج کل اگر تمام دنیا میں تلاش کر لیا جائے تو غالباً اس کے کردار کے مطابق کوئی انسان نظر نہ آئے گا ان ناول نگاروں میں یہ بات ہے کہ جب کسی شخص قصہ یا ہیرو کی تعریف کرنے پر آتے ہیں تو اس کو ایسا فرشتہ صفت انسان بنا دیتے ہیں کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہوتی حکیم محمد علی خاں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

مولانا کے ناول اور تمہید

(موجودہ زمانہ میں جو ناول لکھے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر تمہید کا کہیں بھی پتہ نہیں چلتا یعنی شکسپیر کی طرح وہ ایک دم قصہ کو شروع کر دیتے ہیں اور اگر تمہید کا کچھ خیال رکھا بھی تو صرف اتنا کہ اس سرزمین کا کچھ حال بیان کر دیتے ہیں جہاں سے ناول کا پلاٹ لیا جاتا ہے جو قصے کے اوپر صرف اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ قاری وہاں کے طرز معاشرت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور ان کے خصائل و عادات سے معمولی طور پر واقف ہو جاتا ہے مگر اس طرح کے

بیانات صرف اُن لوگوں ہی کے لئے مفید ہو سکتے ہیں جو جغرافیہ کا علم کافی طور پر رکھتے ہیں اور یہ بخوبی جانتے ہیں کہ آب و ہوا قدرتی مناظر اور ملک کی پیداوار وغیرہ ملک کے رہنے والوں پر کیا اثر ڈالتی ہیں اور یہ ایک ضروری امر نہیں کہ تمام اردو جاننے والے جغرافیہ کے قواعد و قوانین سے بخوبی واقف ہوں ۔ (اردو ناول زیادہ تر معمولی وجہ کے انسانوں میں زیادہ مقبول خاطر ہوئے ہیں مولانا نے کسی غیر ملک کے حالات اپنے ناولوں میں نہیں لکھے جن میں اُن کو اس کی ضرورت پیش آتی کہ وہاں کی سرزمین، آب و ہوا اور باشندوں کے طرز معاشرت کا ذکر کرتے، مولانا نے اپنے ناولوں کی تمہید میں عموماً وہ ضروری اور کام کی باتیں بتلائی ہیں جن کو انسان روزانہ زندگی میں نظر انداز کر جاتا ہے) کیونکہ اس کے نزدیک ان کی کچھ اہمیت نہیں ہوتی ان کو ناول لکھتے وقت یہ خیال رہتا ہے کہ تمہید میں اس قسم کے واقعات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ یہ بتلائیں کہ ہندوستانیوں کا طرز معاشرت اور بود و باش کا طریقہ یہ ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستانی اس سے بخوبی واقف ہیں (وہ انسان کی ذات پر اپنے ناول کی تمہید لکھتے ہیں پہلے مولانا تمہید میں ہر انسان کو اس کے حالات کی طرف رجوع کرتے ہیں پھر اس کے فرائض

یاد دلاتے ہیں۔ بعد ازاں اس کی مختصر زندگی اور دنیا کی بے ثباتی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اس تمہید پر وہ کل قصہ کی عمارت کھڑی کرتے ہیں اور زندگی کے ان واقعات کو لیتے ہیں جو بذات خود بہت ضروری نہیں معلوم ہوتے بلکہ اور واقعات کی طرح نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں یہی معمولی واقعات ہوتے ہیں جو انسان کو کبھی جاہل اور کبھی عالم اور کبھی تہذیب یافتہ بنا دیتے ہیں کیونکہ انھیں کی بدولت اس کے چال چلن اور طرز معاشرت کا پتہ چلتا ہے (مولانا کے ناولوں کی تمہید بعض اوقات قصہ کے اشخاص پر روشنی ڈالتی ہے "مراۃ العروس" کو دیکھئے آغاز قصہ میں آپنے تمہید لکھی ہے جو کسی جگہ درج ہے اس کو پڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں خاکساری۔ عاجزی۔ ملنساری۔ راستبازی اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے اور بد زبانی۔ بد اخلاقی۔ بےحیائی بدچلنی وغیرہ کی مذمت کی گئی ہے اور وہ سب دو متضاد کیرکٹروں کے ذریعے سے دکھلائی گئی ہیں) اس کے علاوہ "محصنات" کو لے لیجئے اس میں بھی تمہید موجود ہے جس میں مولانا نے اپنے اس ناول کے لکھنے کی وجہ بتلائی ہے یعنی یہ کہ عشق کے برے نتائج کو دکھلایا ہے اور بچپن میں جو

باتیں انسان کی فطرت میں جذب ہو جاتی ہیں وہ مرتے وقت تک نہیں چھوٹ تیں ہم کو "ایا می" کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے اس کی تمہید میں مولانا نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے قدیم رسموں کو ترک کر دیا ہے اور ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر لی ہیں ان میں ایک بیوہ عورتوں کی شادی ہے جو مسلمانوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اپنے یہاں بھی بند کر دی اور بیوہ کی شادی کرنا اپنی اور اپنے خاندان کی ذلت اور باعث رسوائی خیال کرنے لگے اسی بات کو آپ نے ناول کے پیرایہ میں لکھا ہے۔

(مگر اور ناول نگاران اردو کے کارناموں پر نظر ڈالنے سے ہم کو اس معاملے میں بہت زیادہ مایوسی ہوتی ہے مولانا شرر ہی کو لے لیجئے ان کے جتنے ناول ہیں اُن میں اس طرز کی تمہید کہیں بھی نہیں نظر آتی۔ ان کے یہاں صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ جس قوم کے حالات پر ناول تحریر کرتے ہیں اُس کے قدرتی مناظر اور وہاں کے لوگوں کی بود و باش پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں حقیقتاً ان کے ناولوں کی تمہید میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملتا اس کے ساتھ ہی فوراً قصّہ کا آغاز ہو جاتا ہے) ناول کا دراصل مقصد جو ہے وہ سوسائٹی کی برائیاں دور کرنا ہے جو

اخلاقی تعلیم سے درست ہو سکتی ہیں ان کے تاریخی ناولوں کو چھوڑ کر اگر معاشرتی ناولوں کو دیکھا جائے تب بھی یہ مایوسی برابر قائم رہتی ہے اس کو مولانا کے پیرو اس طرح رد کریں گے کہ مولانا خفیہ طور پر اخلاقی تعلیم دئے جاتے ہیں یہ کسی حد تک درست بھی ہے مگر اس کا اطلاق ان کے کل ناولوں پر نہیں ہوتا۔

مولوی نذیر احمد کے یہاں بھی یہ بات موجود ہے کہ وہ خفیہ طور پر بھی اخلاقی تعلیم دیتے ہیں مگر پھر بھی وہ اس کو تمہید میں لکھ دیتے ہیں اور بعض اوقات وہ اپنے مولویانہ رنگ میں علی الاعلان اخلاقی باتیں بیان کرنے لگتے ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار اور حکیم محمد علی خاں پر بھی مولانا کو اس معاملے میں فوقیت حاصل ہے کیونکہ ان کے ناول بھی صرف اسی طرح کی تمہید رکھتے ہیں جس طرح کہ مولانا عبدالحلیم شرر کے ناول لکھے گئے ہیں۔

مشاہدہ اور مولانا کی نظر انسان خود بخود کسی چیز کی طرف بڑی بڑی مشکل سے رجوع ہوتا ہے یعنی اس کے آبا و اجداد جو کچھ کرتے چلے آئے ہیں زیادہ تر وہ اسی پر کاربند رہتا ہے یہی حال انشاء پردازِ

اردو کا تھا وہ بھی اپنے گذشتہ شاعروں اور اردو نثاروں
کی پیروی کرتے رہے وہی بات جو وہ کہہ گئے تھے اس کو
یہ دوسرے الفاظ میں ادا کرتے رہے یہی حال اردو کے
افسانہ نگاروں کا بھی تھا وہ قصوں میں کوئی نئی بات ایجاد
نہ کرتے تھے اور وہی واقعات ایک کتاب سے دوسری کتاب
میں لے کر نئے اسلوب سے بیان کرتے جاتے تھے۔ سرور
کے زمانے تک انشا پردازان اردو نے اپنی کتابوں میں
ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جن کا حضرت انسان سے بہت
کم تعلق ہے۔ وہ دنیا کے تمام واقعات اور روزانہ زندگی کے
معاملات کو دیکھتے تھے ان کے نتائج بھی پاتے تھے مگر کبھی
ان پر یہ خیال نہ کرتے تھے کہ یہ واقعہ کسی وجہ سے ہوا ان کے
کیا کیا نتیجے ہوں گے؟ ہم نے کیا غلطی کی تھی جس کی وجہ سے ہمارے
کلنک کا ٹیکہ لگا۔ ہم نے ایسی کیا بات کی تھی جس کی بنا پر ہم
باعث تحسین و آفرین ہوئے' وہ کون کون سی چیزیں ہیں
جن سے ہم کو نقصان پہنچتا ہے اور کون کون سی چیزیں ہمارے
لئے مفید ہیں' ان تمام چیزوں سے ہمیں کیا تعلق ہے اور وہ
ہماری زندگی کے لئے کیوں اس قدر اہم ہیں' یہ دنیا کے فساد

اور جھگڑے کن کن باتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اور کس طرح ہم اُن سے درگذر کر سکتے ہیں ؟

(مولوی نذیر احمد سے پہلے اردو ادب میں کافی تعداد میں افسانہ نگار گذر چکے تھے جنھوں نے کامل انسانی زندگی کو نہیں دیکھا یا یوں کہا جائے کہ اُن کی نظر مشاہدہ کوتاہ تھی مرزا رجب علی بیگ سرور کے " فسانہ عجائب" ہی کو لے لیجیے جس میں فاضل مصنف نے اپنے افسانہ کا موضوع انسان قرار دیا ہے مگر ان کی نظر انسان کے ان معمولی افعال اور حرکات تک نہیں پہنچی جو اس کی زندگی پر بہت بڑا اثر رکھتے ہیں) وہ ایک خاص طبقہ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے پھر بھی وہ ایک حسن و عشق کا افسانہ ہے مگر طلسم و سحر سے پر ہے - کتاب کھولتے ہی طلسم اور جادو کی گلکاریاں نظر آتی ہیں غرض اس کتاب میں جو بات ہم ڈھونڈتے ہیں وہ موجود ضرور ہے مگر کمی کے ساتھ۔ (اسی مصنف کی دوسری کتاب "شرر عشق" میں بھی انسانوں کو چھوڑ کر جانوروں کی طرف توجہ کی گئی ہے) اس افسانہ کا دراصل قصہ یہ ہے کہ کسی شخص نے جنگل میں سارس کا ایک جوڑا پھرتا ہوا دیکھا

اور نر کو مار ڈالا اس کی مادہ پر محبت کا جذبہ اس قدر غالب ہوا کہ وہ اُس کی جدائی کو گوارا نہ کر سکی اور لکڑی جمع کر کے ستی ہو گئی۔ اس میں انھوں نے جانوروں کی محبت کی طرف اشارہ کیا ہے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرزا موصوف کی قوت مشاہدہ بہت دور دور کے سفر طے کرتی ہے مگر پھر بھی اس خیال سے کوتاہ ہے کہ وہ انسان کو بالکل نظر انداز نہ کر جاتے ہیں اور در اصل جو افسانہ یا ناول کا مقصد ہونا چاہئے اس میں ناکام رہتے ہیں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور کے بعد کافی تعداد میں نثار گذرے ہیں مگر کسی نے افسانہ یا ناول نویسی کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ شہید۔ بیخبر۔ اور امیر مینائی وغیرہ نے مختلف صورتوں میں اردو نثر کو ترقی دی اور بکثرت اردو کے مضامین لکھے اور سر سید احمد نے تو در اصل ان ہی باتوں پر مضامین لکھے جو انسان کو دنیا اور دین دونوں کے قابل بنانے کے لئے تھیں مگر ہم کو نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُن کے ایسے افسانے یا ناول نہیں ملتے جو انھوں نے لکھے ہوں اب مولوی نذیر احمد

کی باری آتی ہے جن کے ناولوں کو دیکھنے سے یہ بخوبی معلوم ہوجاتا ہے
کہ ان میں کہیں انسان کا تعلق دیو اور پریوں سے نہیں
رکھا گیا ہے انھوں نے اس قدیم راستہ سے فوراً منہ
موڑ لیا اور ان واقعات کو چھوڑ دیا جو انسان کے کسی کام
کے نہ تھے ان کا ایک دم طلسم وسحر کو چھوڑ کر انسان کی طرف
رجوع ہونا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اُن کی قوت مشاہدہ
بہت تیز اور وسیع تھی کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد
بھی اپنے گذشتہ انشا پردازوں کی طرح طلسم وسحر کی
وادی میں غوطہ کھاتے اگر ان کی لڑکیوں کی تعلیم درمیان میں
حائل نہ ہوجاتی۔ یہ بھی کسی حد تک درست ہے مگر سب
سے بڑی بات جس نے ان کو اس طرف متوجہ کیا تھا
یہ ہے کہ انھوں نے چونکہ مختلف حالتوں میں زندگی بسر کی
تھی اس لئے سوسائٹی کی خرابیوں سے بخوبی واقف تھے
جس کو وہ چاہتے تھے کہ جلد دور کر دیں مولانا عبدالحلیم صاحب
شرر کے مشاہدہ کے متعلق ایک صاحب لکھتے ہیں۔

[1] شرر میں یہ بڑا عیب ہے کہ وہ اپنی قوت مشاہدہ

---

[1] رسالہ ادیب الہ آباد

کو استعمال نہیں کرتے۔"

مولانا موصوف کے اوپر یہ اعتراض کرنا سراسر زیادتی ہے۔ اگر کوئی کچھ اعتراض کر سکتا ہے تو صرف اس حد تک کہ مولانا کا مشاہدہ سطحی ہے اور واقعات کی تہ تک نہیں پہنچتے، یہ کہہ دینا کہ وہ قوت مشاہدہ کا بالکل استعمال ہی نہیں کرتے ایسا ہے جیسا کوئی بے بہرہ شخص کسی عالم کو کہہ دے کہ 'جاہل' ہے۔ ان کا مشاہدہ کچھ تو تاریخوں پر منحصر ہے اور کچھ ان مردوں اور عورتوں پر جو ہم سے روزانہ ملتے جلتے ہیں ان کا تاریخی مشاہدہ صرف ان کے تاریخی ناولوں کے لئے مفید ہے۔ معاشرتی ناول میں کوئی تاریخی واقعہ بیان نہیں کیا گیا۔ انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں ہی کی بدولت اردو میں یہ رتبہ حاصل کیا ہے۔ انھیں ناولوں کے لئے وہ غیر ممالک مثلاً اسپین۔ فرانس۔ مصر۔ فارس اور عرب وغیرہ کی تاریخوں کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہوئے اور انھیں ناولوں کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قوت مشاہدہ کو زیادہ کام میں نہیں لاتے یعنی واقعات کی چھان بین زیادہ نہیں کرتے اور جو واقعات آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں انھیں پر اطمینان ہو جاتا ہے مگر اس پر بھی رام بابو سکسینہ صاحب نے اس کا

اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے تاریخ کا اور خصوصاً اسلامی تاریخ کا خوب مطالعہ کیا ہے ان کے علاوہ ان کے اخلاقی ناول اپنے ملک کے واقعات اور طرز معاشرت کے مشاہدہ پر مبنی ہیں جن میں انھوں نے ہندوستانیوں ہی کا ذکر کیا ہے اور انھیں کی سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اب ہم کو ان کے ناولوں اور مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں یہ بات دیکھنی ہے کہ انھوں نے کس نظر سے واقعات کا مشاہدہ کیا ہے ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ شرر صرف سطحی واقعات سے مطمئن ہو جاتے ہیں وہ صرف ان رسموں اور واقعات کو لیتے ہیں جن پر ہر فرد و بشر کی نظر پڑتی ہے مگر مولانا نذیر احمد اس کے بالکل خلاف پائے جاتے ہیں وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ بچہ پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے تمام لوازمات پر غور کرتے ہیں مثلاً یہ کہ بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو ماں اس کو کس طرح سینے سے لگائے پھرتی ہے اور جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی محبت میں بھی تبدیلی ہوتی جاتی ہے صرف یہی نہیں بلکہ اس کے مدارج بھی تبلاتے ہیں۔ اور مثالیں دے کر سمجھاتے ہیں پھر وہ بچوں اور والدین

دونوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ جس طرح
کی والدین اُن کو تعلیم دیں گے وہ ویسے ہی بڑے ہوکر حرکات
اور افعال کے مرتکب ہوں گے اس کی مثال "توبۃ النصوح"
میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے یہ ناول لکھا تھا
"کلیم" جیسے شخص قصہ کو انھوں نے ناول کے صفحوں پر پیدا کرکے
یہ بات ثابت کی کہ جو باتیں بچپن سے انسان کی فطرت میں داخل
ہو جاتی ہیں وہ مرتے وقت تک نہیں چھوٹتیں اُس کی دوسری مثال
کے لئے "مراۃ العروس" میں "اکبری" کو دیکھئے کہ جس طرح اس کی نانی
وغیرہ نے اس کے عادات کو بچپن میں بگاڑ دیا تھا شادی
ہونے کے بعد بھی وہ اطوار ویسے ہی قائم رہے۔ جب والدین
لڑکیوں کو پال پوس کر بڑا کر دیتے ہیں تب اُن کی شادی ہوتی ہے
اس کے بعد مولانا یہ بتلاتے ہیں کہ اُن کو شادی کے بعد دوسروں
کے گھر جانا پڑتا ہے اور نئے لوگوں سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔
وہاں نیک اور سلیقہ کار لڑکیاں سب کے آنکھوں کا تارہ
ہو جاتی ہیں اور بدزبان اور بیہودہ اپنے حرکات کا بُرا نتیجہ
پاتی ہیں۔ ان کی بھی مثال "مراۃ العروس" میں ڈیکریکٹر
"اصغری اور اکبری" ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کے لئے امور

خانہ داری، بچوں کی تربیت وغیرہ پر وہ اُن کی مایۂ ناز تصنیف ہیں ماں باپ کی محبت اور عزت اور بزرگوں کی اطاعت ان کا خاص سبق ہے۔ یہ ہیں وہ واقعات جن پر مولانا کی سب سے پہلے نظر پڑی اب تک تو صرف لڑکیوں کے لیئے جو انھوں نے خاص طور سے مشاہدہ کیا تھا اس کا ذکر تھا۔ مگر اب لڑکوں اور مردوں کی طرف بڑھیئے تو "توبتہ النصوح" پھر ملاحظہ کیجیئے تو معلوم ہو گا کہ اس میں والدین اور لڑکوں کو کیا کیا نصیحتیں کی گئی ہیں۔ "کلیم" کو کیا کیا باتیں نہیں بتلائی گئیں۔ اس کے علاوہ "ابن الوقت" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مولانا نے مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم افسانہ کے پیرایہ میں دی ہے کہ اپنی وضع چھوڑ کر دوسروں کی وضع اختیار کر لینا کسی طرح درست نہیں۔ اس قصہ میں انھوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کے وضع قطع ظاہری لباس اور اُن کی بود و باش اختیار کرنے سے روکا ہے اور اس کی خرابیاں بتلائی ہیں۔ "محصنات" یا "فسانہ مبتلا" دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد لڑکوں کو جوانی کے عالم کی ہرزہ گوئی سے روکنا ہے کیونکہ ان کے مشاہدے سے جیساکہ

اُنھوں نے اس ناول میں دکھلایا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ والدین کا لاڈ پیار بچوں کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور جو خراب آب و ہوا میں پالے جاتے ہیں اُن کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جہاں جاتے ہیں نکالے جاتے ہیں چاروں طرف سے انگلیاں اٹھتی ہیں اور جب مرتے ہیں تو کتے کی موت۔ غرض انھوں نے اپنے ناولوں کے مشاہدہ میں نہایت باریکی اور سنجیدگی سے کام لیا ہے غرض مولانا کو مولانا شررؔ کی طرح اپنے ناولوں کے لئے مشاہدہ کی تلاش میں غیر ممالک میں نہیں جانا پڑا اور نہ غیر ممالک کی تاریخوں کو دیکھنا پڑا اُن کو اپنے ناولوں کے لئے جو کچھ دیکھتے ہیں وہ بہت کافی معلوم ہوتا ہے دراصل مشاہدے کے یہی معنی بھی ہیں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ چونکہ وہ خاص خاص برائیوں کو انسانوں میں دیکھتے ہیں تو اُن کو لکھتے ہیں۔ سوسائٹی کو بالکل فراموش کر جاتے ہیں۔ وہ خاص طور پر ان عیوب کو لیتے ہیں جو سوسائٹی میں عام طور پر پائے جاتے ہیں اور جن کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی گو کہ وہ بے حد نقصان دہ ہوتے ہیں مثلاً بیاہ شادی میں وہ ان تمام رسموں کو جو نہ صرف

ایک شخصیت کو نقصان پہنچاتی ہیں بلکہ سماج کے لئے بھی مفید نہیں ہوتیں ۔ بہت برا خیال کرتے ہیں ۔ عورتوں کے زیورات پہننے کو وہ بہت معیوب خیال کرتے ہیں ۔ بیوہ عورتوں کی شادی پر زور دیتے ہیں ۔ لڑکیوں کو جاہل رکھنے کا جو عام خیال ہے اس کے وہ سخت خلاف ہیں اور اُن کو تعلیم دینے کے بڑے زبردست حامی ہیں جسکو اُنھوں نے اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر دکھلا دیا اس کے علاوہ جب مسلمانوں کی سوسائٹی پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک معترض کی حیثیت سے ۔ چنانچہ مسلمانوں کی سوسائٹی کو اس نظر سے دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی' دو بہت بڑے نقص ہیں .... میں نے ایک کے رفع کرنے کی کوشش کی ہے .... تو دوسرے نقص کو رفع کرنے میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے"[۱]

یہ لکھا جا چکا ہے کہ مولانا عبد الحلیم شرر نے جو غیر ممالک سے واقعات لے کر اپنے ناول تیار کئے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ

---

[۱] محصنات

ہوگی جو دلگداز کی اس تحریر سے ظاہر ہے۔

"سچ یہ ہے کہ ہماری زندگی اس قابل ہی نہیں
کہ ناول ان صفحوں پر لائی جائے اور جو کچھ اس سوسائٹی
میں ہے اگر دکھایا جائے گا اُس سے سوا اس کے کہ ہم
اپنی ذلت و تباہی کو عالم آشکارا کر دیں اور کچھ نہ ہوگا۔"

دلگداز جنوری ۱۹۰۷ء

مولوی نذیر احمد نے ان باتوں کا بالکل خیال نہ کیا جس سے دلگداز ڈرتا تھا۔ اور ان باتوں کو عالم آشکارا کر دیا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچتا تھا کیونکہ یہ خرابیاں ایک ایسے مرض کی طرح ہیں جو جسم کو اندر ہی اندر بیکار کر دیتی ہیں اسی بات پر لوگ اُن سے بدظن ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ مولانا نے مسلمانوں کی سوسائٹی کے صرف اس طبقے کا مشاہدہ کیا ہے جن میں سے یہ خرابیاں ہیں کیا وہ ان کی اچھی باتوں کو نہ لکھ سکتے تھے؟ یہ درست ہے کہ انھوں نے دراصل اسی طبقے کے حالات قلمبند کئے ہیں جس میں یہ بُرائیاں پائی جاتیں ہیں تاکہ ان کی اصلاح جلد ہو جائے مگر ان واقعات کے بیان کرنے میں کیا فائدہ جو دراصل اچھے ہیں ہی اور جن میں کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت ہی نہیں۔

(دوسرے ان کو یہ بھی ثابت کرنا تھا کہ متوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگی ایک سادہ ورق نہیں ہے بلکہ اس پر بھی کچھ دھبے ہیں سرشار بھی مشاہدہ میں کامل ہیں اُن کا اور مولوی نذیر احمد کا مقابلہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کو بھی انھیں واقعات کے بیان کرنے میں لطف آتا ہے جن کو نذیر احمد نے لیا ہے مگر حکیم محمد علی خاں کا مشاہدہ تاریخ پر منحصر ہے شرر تو تاریخی ناولوں کے مشاہدے میں سطحی ہیں مگر حکیم موصوف تو واقعات کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں پھر بھی ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حکیم صاحب بھی روزانہ زندگی کے واقعات کا مشاہدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ۔)

(مواد ناول نگار کی قوت مشاہدہ

مواد اور اُس کی جستجو

پر منحصر ہوتا ہے) ناولوں کے لئے ہر جگہ ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جو اُس کی ناول کے لئے موزوں ہوں مگر یہ محض ناول نگار کی جستجو پر منحصر ہوتا ہے مواد کے تلاش کرنے کے بھی کئی ذرائع ہیں مگر ناول نگاران اردو نے دو ذریعوں کو اختیار کیا ہے ایک تو یہ کہ واقعات کو تاریخی کتب سے لے لیا اور ان میں وہ عناصر پیدا کرکے جو ناول کے لئے ضروری ہیں ناول لکھ ڈالے بہتیرے ناول نگار بجائے اس کے کہ

خود مطالعہ کریں کسی ناول کو دیکھ لیتے ہیں اور اُس کو بدلکر
پھر لکھ ڈالتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اُس
کو بخوبی ذہن نشین کر لیتے ہیں جو ناول لکھتے وقت اُن کے بڑے
زبردست معاون ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر ہی کو لے لیجئے
دیکھئے وہ مواد کہاں سے لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تاریخی و معاشرتی
ناولوں میں یہ دونوں طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ اپنے تاریخی ناولوں
کے واسطے تاریخی کتابوں کا بخوبی مطالعہ کرتے ہیں۔ اسپین۔ فرانس
عرب وغیرہ کی تاریخ کا وہ خوب مطالعہ کرتے ہیں اور ان واقعات
کو لیتے ہوئے جو در اصل کچھ اہمیت نہیں رکھتے اور غلط ہونے
کے باوجود بھی صحیح تصور کئے جاتے ہیں ان واقعات ہی کی
بدولت آپ اسکاٹ کی طرح مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کو
دوبارہ حاصل کرتے ہیں رہے معاشرتی ناول ان میں مولانا شرر
نے تاریخ کو دخل نہیں دیا ہے ان کے لئے وہ صرف ہندوستانیوں
ہی میں مواد کی تلاش کرتے ہیں مگر تاریخی ناولوں کے مقابلے
میں ان کی زیادہ اہمیت نہیں۔ ان پر جو ایک اعتراض کیا جاتا
ہے وہ یہ ہے کہ وہ مواد کو غیر ملک سے لے کر یہ بھول جاتے
ہیں کہ یہ ایک غیر ملک کی خصوصیات کا حامل ہے اور وہ

اسے بالکل ہندوستانی جامہ پہنا دیتے ہیں یہ اعتراض ایک حد تک صحیح بھی ہے مگر اسکا جواب یہ ہے کہ وہ ان واقعات کو ہندوستانیوں کے لئے عام فہم بنانا چاہتے تھے غرض وہ اپنے معاشرتی اور اخلاقی ناولوں کے لئے ان لوگوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو آپس میں روزانہ ملتے جلتے ہیں ۔ "دلکش" ۔ "طاہرہ" "آغا صادق کی شادی" اور "غیب دان دلہن" وغیرہ ہندوستانیوں کی سوسائٹی کا چربہ ہیں) ناولوں کے مواد کے لئے ان کو تاریخ کا مطالعہ نہیں کرنا پڑتا ۔ مگر حکیم محمد علی خاں کو ہندوستانیوں کے حالات لکھنے کے لئے بھی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے حکیم محمد علی خاں نے بھی تاریخی اور معاشرتی ناول لکھے ہیں مگر ان کے تاریخی ناول اس قدر زیادہ تاریخی پہلو لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ بذات خود تاریخ معلوم ہونے لگتے ہیں ۔

(پنڈت رتن ناتھ سرشار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تاریخی ناولوں کے لکھنے کی اس قدر خواہش نہ تھی جتنی کہ مولانا شرر اور حکیم محمد علی خاں کو ۔ وہ ہندوستان کے باہر کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ ہندوستانیوں کے حالات ہی سے مطمئن رہتے ہیں) بعض اوقات تو ان کو مواد کی تلاش میں لکھنؤ کے باہر

بھی نہیں جانا پڑتا۔ اور تلاش کرنے پر ان کو اس قدر مواد مل جاتا ہے کہ وہ اس کو بمشکل ناول میں سمو لیتے ہیں۔ ان کی تصانیف سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ عیش باغ کے میلے، اور پتنگ بازی کے جم غفیر انکے لئے کافی مواد رکھتے تھے۔ اور "فسانہ آزاد" میں تو انھوں نے نواب۔ افیمی، فاقہ مست۔ بٹیر باز۔ پتنگ باز۔ عاشق۔ رنگیلے۔ چھبیلے۔ طوائف۔ پولیس۔ کانسٹبل۔ چور۔ اچکے۔ چنگی کے محرر۔ بنگالی بابو۔ ٹھاکر صاحب۔ مسلمان وغیرہ وغیرہ کی حالات کا مفصل ذکر کیا ہے۔ یہ مسلم الثبوت امر ہے کہ "فسانہ آزاد" کے برابر مواد اور کسی ناول میں ملنا بہت دشوار ہے۔

مولوی نذیر احمد اپنے مواد کی تلاش میں کہیں دور دراز ملکوں کی تاریخ نہیں پڑھتے بلکہ ان کو تو دلی کے باہر جانا ہی نہیں پڑتا۔ یعنی دہلی کی سوسائٹی میں ان کو اپنے ناول کے لئے بخوبی مواد مل جاتا ہے مولوی نذیر احمد سے جو پہلے افسانہ نگار تھے وہ اپنے مواد کی تلاش میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ وہ طلسم و سحر کو بھی اسی میں داخل کر لیتے تھے مگر یہ سب سے پہلی ہستی ہے جس نے حضرت انسان ہی میں مواد ڈھونڈنا چاہا اور دراصل ڈھونڈا ہی زیادہ کسی ایسی چیز کو تلاش نہیں کرتے جو بہت کم مل سکے یعنی میلے

پھیلے تو کبھی کبھی ہوتے ہیں مگر واقعات زندگی جو روزانہ پیش آتے ہیں بے حد ضروری ہے وہ شریف گھرانوں کو دیکھتے ہیں کہ ان میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور وہاں سے مواد ڈھونڈلاتے ہیں مثلاً مسلمانوں میں بیوہ عورتوں کی شادی کا نہ ہونا بس انکے لئے یہی کافی تھا اور انھوں نے اس پر ایک ناول لکھ دیا اس کے علاوہ بچوں کے ماں باپ کی حالتوں پر غور کیا تو اُن کو بھی چند خامیوں اور غلطیوں کا شکار پایا یعنی تربیت اولاد کی خامیوں سے وہ اُن کو آگاہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو بھی یہ تعلیم دیتے ہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے کسی بات کی تقلید نہ کرنا چاہیئے۔ جدید فیشن کی برائیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا نذیر احمد نے "ابن الوقت" لکھا۔ غرض وہ اپنے ناولوں کے لئے مواد کی تلاش سماج ہی میں کرتے ہیں اور معمولی معمولی واقعات پر اپنے ناول کے نقشے کا قصر تعمیر کرتے ہیں۔

مواد اور اس کا انتخاب مواد کی تلاش کے بعد اس کا انتخاب سب سے ضروری ہے۔

ناول نگاروں کو اس بات کا خیال نہ ہونا چاہیئے کہ وہ جس بات کو ایک مرتبہ اپنے کسی ناول میں جگہ دے چکے ہیں وہ دوبارہ

اُن کے ناول کے لئے سود مند نہیں ہوسکتے۔ اردو ناولوں میں یہ اکثر پایا جاتا ہے کہ ایک ناول نگار دوسرے ناول نگار کے ناول کے قصے کا پلاٹ لے کر اور اُس کے مواد میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے خود اپنا ناول تیار کر لیتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر چیز خواہ اچھی ہو یا بری اگر ایک مرتبہ ناول میں لکھی جا چکی ہے تو دوسری مرتبہ بھی اپنا کام پورا کر سکتی ہے مگر مواد کے موجود ہوتے ہوئے اس کے انتخاب کا سوال نہایت اہم ہے۔ یہ ناول نگار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اچھی چیز کو اپنے ناول میں جگہ دے یا بری چیز کو۔

یہ ضرور ہے کہ مواد کے انتخاب کے وقت ناول نگار کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ایسی کوئی بات نہ آنے پائے جس سے سوسائٹی کے اخلاق کو کسی طرح کا بھی صدمہ پہنچے۔ ان کو ایسے مواد کا انتخاب کرنا چاہئے جو مخرب اخلاق ہونے کے بجائے قاری کے اوپر نہایت عمدہ اثر ڈالے اگر اس نظر سے یہ دیکھا جائے کہ ناول نگاران اردو نے کہاں تک اپنے اس فرض کو انجام دیا ہے تو شرر۔ سرشار۔ نیاز۔ حکیم محمد علی خاں۔ راشد الخیری۔ سجاد حسین رسوا اور نذیر احمد کے علاوہ بقیہ اور ناول نگار جو آج کل

حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اس فرض سے بالکل بے خبر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دی - جس کی وجہ سے اُن کے یہاں مواد مفقود ہوتا ہے اس کے علاوہ اگر وہ اپنے ناول میں جدت طبع سے کام لے کر اپنی طرف سے مواد بڑھاتے بھی ہیں تو اُس کے انتخاب میں بالکل ناکام رہتے ہیں وہ اُن میں ایسی ایسی باتیں بیان کر جاتے ہیں جو مخرب اخلاق ہوتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ اُن کو صداقت کا جامہ پہناتے ہیں گو کہ وہ جھوٹ کے پوٹ ہوتے ہیں صرف یہی نہیں بلکہ انتخاب کرنے کے بعد بھی وہ فضول اور بھرتی کے مضامین بیان کر جاتے ہیں جو نہ قصے پر روشنی ڈالتے ہیں اور نہ کچھ اشخاص قصہ سے ان کا سروکار ہوتا ہے۔

ان کو چھوڑ مستند ناول نگاران اردو (جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں) کی طرف رجوع ہونے سے ہماری مایوسی ایک حد تک رفع ہو جاتی ہے کیونکہ انھوں نے مواد کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے گو کہ وہ بھی بعض اوقات غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں مگر پھر بھی ان کے یہاں یہ اس قدر زیادتی سے نہیں ہے کہ وہ خامی کہلائی جائے۔ مولانا عبدالحلیم

سٹرر سے اس میدان میں کافی کامیابی حاصل کی ہے۔ اُن کے
اوپر بھی یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں بھرتی کے
مضامین بیان کر جاتے ہیں اگر یہ اعتراض صحیح ہو سکتا ہے تو اُنکا
اطلاق ان کے صرف ان ناولوں پر ہو سکتا ہے جو دراصل ان کے
شاہکار نہیں ہیں مگر اُن کے بڑے اور مشہور ناول اس خامی سے
بری ہیں انھوں نے اپنے ناولوں کی بنیاد صداقت پر رکھی ہے
اور ہر جگہ یہی کوشش کی ہے کہ مواد صحیح اور درست ہو
اور وہ کہیں بھی ایسی بات کا ذکر ناولوں میں نہیں کرتے
جس سے کسی کے اخلاق کو صدمہ پہنچے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار
کے یہاں خامیاں نہیں پائی جاتیں مگر پنڈت جی پر یہ الزام
عائد کیا جاتا ہے کہ وہ بعض اوقات بیہودہ باتوں سے بھی درگذر
نہیں کرتے تاہم وہ اس قدر کم ہے کہ اگر ان کو نظر انداز کر دیا
جائے تو اُن کے یا سوسائٹی کے اوپر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

مولانا نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے مواد کے انتخاب میں
اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یہ
کتابیں دراصل سوسائٹی کے لئے تحریر کی تھیں اور اُن کا مقصد
برائیوں کو دور کرنا تھا۔ انھوں نے مواد کے انتخاب میں

اس بات کا خیال رکھا ہے جو بہت قابل قدر ہے کہ ایک دوسرے کے ضد واقعات لئے ہیں یعنی اگر وہ نیکی کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے خلاف بدی کا بھی ذکر ضرور کرتے ہیں اسی طرح پھر ان کے یہاں سیکڑوں طرح کی مثالیں موجود ہیں، "اصغری و اکبری" دونوں اچھی اور بُری باتیں ظاہر کرتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ کہیں ایسا مواد قصے میں نہ آجائے جس سے قصہ کو سوائے نقصان کے فائدہ نہ ہو اگر مخرب اخلاق مواد اُن کے یہاں تلاش کیا جائے تو کہیں پتہ نہیں ملتا اس عنصر میں وہ اپنے حریف پنڈت رتن ناتھ سرشار سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔

ظرافت

یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ ہر ناول ظریفانہ طرز میں لکھا جائے اگر اس میں یہ عنصر پایا جاتا ہے تو نہایت خوبی کی بات ہے کیونکہ اس کی وجہ سے ناول نگار قاری کو اپنی طرف رجوع کر لیتا ہے اور جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ناول کے اختتام تک نہایت متوجہ رہتا ہے اور خوب دل لگا کر اُس کو پڑھتا ہے مولوی نذیر احمد نے بھی ظریفانہ طرز کو اسی حد تک پیش نظر رکھا تھا یا یوں کہئے کہ وہ اس قدر ظریفانہ

طبیعت کے واقع ہوئے تھے کہ جب وہ اپنے آپ کو سنجیدہ بنانا چاہتے تھے تو بمشکل تمام سنجیدگی اختیار کرتے تھے ان کے طرز تحریر اور اسلوب بیان میں یہ رنگ بخوبی نمایاں ہے حتیٰ کہ قرآن کریم کے ترجمہ تک میں انھوں نے بعض بعض جگہ ظریفانہ زبان استعمال کی ہے۔ رام بابو سکسینہ صاحب کا آپ کے متعلق یہ خیال ہے۔

"البتہ[1] خاص چیز جو ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ہے وہ اُن کا ظریفانہ رنگ ہے۔ جو ان کے ناول۔ لکچر اور مضامین سب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے اور اس میں پھکڑپن مطلق نہیں ہوتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان کے تمام ناول یہی انداز اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں جن کا ذکر سکسینہ صاحب بھی کرتے ہیں شرر سے اگر مولانا کا مقابلہ کیا جائے تو مولانا کا پلّہ بھاری نکلے گا کیونکہ مولانا شرر کے تمام ناولوں میں یہ بات بہت کم ہے۔ مولانا عبدالقادر صاحب دنیائے افسانہ میں تحریر کرتے

[1] تاریخ ادب اردو۔

ہیں کہ شرر کے تمام ناول اس قدر پیچیدہ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ ان میں ظرافت کے داخل کرنے کا کہیں موقع ہی نہیں ملتا) یہ اعتراض درحقیقت شرر کے اوپر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا جب ہم ان کے چند ایسے ناولوں کو دیکھتے ہیں جن میں انھوں نے ظرافت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ تو ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ جو بات نذیر احمد کے یہاں ہے وہ نہ شرر کے یہاں۔ نہ حکیم محمد علی خاں۔ علامہ راشد الخیری اور رسوا کے یہاں تو یہ عنصر بالکل مفقود نظر آتا ہے)۔

(مگر پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول اس عنصر کو خاص طور پر لئے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر ناول ظرافت سے لبریز ہے" فسانہ آزاد" تو اس کا مجسمہ ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی وہ 'اودھ اخبار' جیسے ظریف پرچہ میں شایع ہوتا تھا اور فاضل مصنف نے بھی اس میں اس پہلو کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر کچھ لوگوں کا ان پر یہ اعتراض ہے کہ وہ بعض اوقات اس قدر رو میں آجاتے ہیں کہ ان کی ظرافت اخلاقی پہلو چھوڑ دیتی ہے تاہم ان کے برابر ظرافت کسی اور کے یہاں موجود نہیں ہے۔ سجاد حسین کا ظریفانہ

ناول "حاجی بغلول" قابل قدر ہے۔ مگر سرشار کا "فسانہ آزاد" ایک ایسا شاہکار ہے کہ اُس کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ رام بابو سکسینہ کا ان کے متعلق یہ خیال ہے:۔

"سرشار کا مقابلہ کوئی اردو نثار نہیں کرسکتا مگر یہ ضرور ہے کہ اُن کی ظرافت میں تھوڑا بہت پھکڑپن آجاتا ہے اور وہ اس میں اس قدر مست ہوجاتے ہیں کہ فحش اور بیہودہ باتیں بکنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔"

عنصر عشق اشخاص قصہ کے عنوان میں ہم مولانا عبدالقادر صاحب سروری کا اعتراض حسن کے متعلق درج کر آئے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی ایک اعتراض تھا کہ مولانا کے ناولوں میں عشق و محبت موجود نہیں ہے اس عبارت کو ہم پھر یہاں درج کرتے ہیں۔

"اسٹیونسن کے ناول "ٹریزر آئیلینڈ" کی طرح یہ ہر قسم کے مخرب اخلاق عنصر حتیٰ حسن و عشق

سے بھی خالی ہیں۔"

مولانا کا یہ خیال کہ اُن کے ناول عنصر عشق سے بالکل خالی ہیں۔ یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپ نے یہ اعتراض مولانا کے ناولوں کو بغیر پڑھے کر دیا ہے یا کسی دوسری کتاب سے ہو بہو نقل کر دیا ہے مولانا کے ناولوں میں اگر ایک شخص مختلف درجوں کا عشق ڈھونڈے تو اُس کو کبھی مایوسی نہیں ہو سکتی۔ معلوم نہیں مولانا کا یہاں پر "عشق" سے کیا مفہوم ہے۔ بہر حال ہم یہاں پر عشق کے مختلف پہلوؤں کو لیتے ہیں جو مولانا کے ناولوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اگر اس سے مراد مولانا والدین کا اپنے بچوں سے اور بچوں کا اپنے والدین سے عشق لیتے ہیں تو وہ مولانا کے ناولوں میں بہت زیادہ موجود ہیں "مراۃ العروس" کو دیکھیے اس میں "دور اندیش خاں" کی محبت اپنی لڑکیوں سے ظاہر ہے "بنات النعش" میں سلطانہ بیگم کو اپنی لڑکی "حسن آرا بیگم" سے کیا کچھ کم عشق ہے اس کے علاوہ "توبۃ النصوح" کو دیکھیے جس میں "نصوح" جو کلیم کے اس قدر خلاف رہتا ہے اور اُس کو گھر سے بھی نکال دیتا ہے پھر بھی وہی عشق غالب

آجاتا ہے کہ وہ اُس کو پولیس سے چھڑا کر لاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس طرح کی کافی تعداد میں مثالیں ملیں گی اگر مولانا کا مطلب شوہر اور بیوی کے عشق سے ہے تو وہ "توبۃ النصوح" میں موجود ہے۔ 'نصوح' اور اُس کی بیوی کی محبت دیکھنے کے قابل ہے "مرأۃ العروس" میں ہم کو اس سے بھی بہتر مثال "اصغری خانم" اور اس کے شوہر کی محبت کی ملتی ہے۔

مولانا موصوف اگر اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ انسان کو انسان سے محبت اور عشق ہونا چاہیئے تو اُن کی کتابیں اس سے بھی پُر ہیں ان کے تمام ناول ہر انسان کو یہ سبق دیتے ہیں کہ انسان آپس میں برابر ہیں۔ خدا کی نظر میں بھی ایک ہیں۔ وہ اور بات ہے کہ عہدہ کسی کا بڑا ہو اور کسی کا چھوٹا مگر سب اولاد آدم ہیں۔ اسی وجہ سے اُن میں کوئی فرق نہیں۔ تعصب اور بیوفائی کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہر جگہ یہی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بھائی بھائی ہیں۔ ایک انسان کو دوسرے کے غم اور شادی میں شریک ہونا چاہیئے۔ اگر اُن کا مقصد عشق حقیقی سے ہے تو "توبۃ النصوح" سے وہ بخوبی ظاہر ہو جائیگا۔ وہ عشق حقیقی یہی تھا کہ جس نے نصوح کو اس بات پر

آمادہ کر دیا تھا کہ اپنے خاندان کی اصلاح کرے چنانچہ اس کے پیچھے اپنے لڑکے تک کی پرواہ نہ کی - یہاں تک کہ اس کا انتقال ہو گیا اس سے زیادہ کسی کو اور کیا چاہیئے۔

ان کو چھوڑ کر اب ہم عشق کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو موجودہ زمانے کے ناولوں میں پایا جاتا ہے اگر مولانا کا مطلب اس عشق سے تھا تو در اصل اُنھوں نے مولانا نذیر احمد کے ساتھ زیادتی ہی نہیں کی بلکہ ظلم کیا ہے کہ یہ دھبّہ اُن پر لگا دیا ہے - مولانا کا یہ خیال تھا کہ اس قسم کا عشق باعث بربادی ہوتا ہے وہ عشق سے مراد وہ عشق لیتے ہیں جو در اصل انسان میں پایا جاتا ہے بلکہ وہ نہیں جو تھوڑی دیر کے لئے انسان میں اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیئے پیدا ہو جاتا ہے ایسا عشق اُن کی نظر میں بہت زیادہ معیوب ہے چنانچہ اس کی خرابیاں انھوں نے "محصنات" میں بتلائی ہیں جس میں "مبتلا" "ہریالی" کے عشق میں مبتلا ہو کر جانوروں کی موت مرتا ہے ان کے ناول ایسے عشق کے پلندے نہیں جو وصال کے اوپر ہی ختم ہو جائیں اور آگے اس کا کچھ پتہ ہی نہیں دیں۔ ان کے ناولوں میں عشق مرتے وقت تک انسان پر

غالب رہتا ہے جو کبھی گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا رہتا ہے۔ ان کا عاشق مزاج ہیرو ان لوگوں میں نہیں ہوتا جو وقت پڑنے پر عشق کو بُرا بھلا کہے اور دنیا کو چھوڑ کر جنگل میں قیام کرے مولانا عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور حکیم محمد علی خاں کے ناولوں میں بھی اسی طرح کا عشق پایا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ عام بازاری ناول نگاروں کا تو کچھ مذکور نہیں ان کے ناول تو عشق کو سوائے بدنام کرنے کے اور کچھ بھی نہیں کرتے۔

جوش اور تحریک جب کوئی قصہ یا افسانہ لکھا جاتا ہے تو اُس میں جوش اور تحریک کو تدریجی ترقی دی جاتی ہے اور ہر کام کا یہی قاعدہ بھی ہے۔ مولوی نذیر احمد نے اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے ناول لکھے ہیں یعنی ان کو شروع کرنے کا طریقہ انھوں نے "آہستگی" رکھا ہے۔ وہ ایک دم کیرکٹروں کو جوش نہیں دلا دیتے بلکہ قصہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی نرم مزاج اور اعتدال کو ساتھ لئے ہوتے ہیں مگر جوں جوں قصے میں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر جوش بھی ترقی پاتا ہے۔ اور اشخاص قصہ سے

حرکتیں بھی اسی کے مطابق سرزد ہوتی ہیں یہ جوش ایسا نہیں ہوتا کہ چند منٹ بعد ٹھنڈا پڑ جائے بلکہ برابر اعتدال کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ تحریک بھی یہی انداز رکھتی ہے وہ اس میں ایک دم اتار اور چڑھاؤ پسند نہیں کرتے، قصہ کے بیچ میں وہ بھی اپنے انتہائی مدارج کو پہنچ جاتی ہے اس وقت قاری اور قصہ کے کردار ایک ہی حالت میں ہوتے ہیں یعنی وہی جذبات قاری کے اوپر بھی طاری ہوتے ہیں جو اشخاص قصہ پر اس وقت تھے مولانا اعتدال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور فوراً اس کے کم کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یعنی قصہ جب تمام ہونے لگتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ جوش اور تحریک بھی کم ہوتا جاتا ہے یہ بات قریب قریب سب مستند ناول نگاروں میں پائی جاتی ہے۔

ان کے اشخاص قصہ اکثر جوش میں غلطیاں کر جاتے ہیں وہ اس لئے کہ اگر ایسا نہ کریں تو وہ بالکل غیر فطری معلوم ہونے لگیں۔ یہی حال مولانا شرر کے ناولوں میں بھی ہے۔ انکے اشخاص قصہ غلطیاں سرزد کرتے ہیں مثلاً اکثر فوج کے بیچ میں گھس کر لڑا دیا کرتے ہیں۔ سرشار اور حکیم محمد علی خاں نے بھی اس کا بہت زیادہ

خیال رکھا ہے۔

مولانا شرر کے اکثر ناول مثلاً "فردوس بریں" اور "غیب دان دلہن" وغیرہ وغیرہ قصے کے منتہائے کمال تک راز سربستہ رہتے ہیں اور قاری کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ قصہ کیا ہے؟ اس میں بھی ان کا جوش اسی طرح بر کام آتا ہے۔جس طرح ان کے اور ناولوں میں ہے۔مولانا نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں قاری اور اس قصہ کے کیرکٹر کو جوش دلانے کے واسطے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے اشخاص قصہ خواہ کتنا ہی غصہ ہوں مگر کبھی کوئی بیہودہ گوئی سے اپنی زبان کو آشنا نہیں کرتا اور وہ کبھی اُن سے جوش میں ایسی باتیں نہیں کہلواتے جو اُن کو زیب نہ دیتی ہوں۔

ڈراما ئی پیش کشی مولوی نذیر احمد کی یہ پہلی ہستی ہے جس نے اس کو ناولوں میں جگہ دی ہے۔ وہ واقعات کی ہو بہو تصویر اُتار دیتے ہیں اور کیرکٹروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ یہ

معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اور کر رہے ہیں بالکل ٹھیک ہے اور ہماری روزانہ زندگی کے مطابق ہے۔ اس کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالی واقعات نہیں ہیں جنکو یکجا کر دیا گیا ہے بلکہ یہ وہ واقعات ہیں جو ایک انسان کو پیش آرہے ہیں قاری کو پڑھتے ہوے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ہمارے سامنے ایک انسان کھڑا ہے اور یہ تمام باتیں اس پر گزر رہی ہیں وہ اپنے اشخاص قصہ کو قاری سے زیادہ دیر کے لئے جدا نہیں کرتے بلکہ اُس کو سامنے ہی رکھتے ہیں۔ یہ طریقہ ڈاکٹر ہادی رسوا کے ناول "سرگذشت امراؤ جان ادا" میں اختیار کیا گیا ہے وہ اس کو شہر در شہر پھراتے ہیں اور پھر قاری کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں ان کے ناول "ابن الوقت" میں تھوڑا بہت اس کا خیال رکھا گیا ہے مولانا نذیر احمد بھی علامہ راشد الخیری کی طرح شادی وخوشی رنج وغم کی مجسم تصویر پیش کرتے ہیں اور ان کے ناول دنیا میں والدین بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں کے تعلقات کا مجسم آئینہ ہوتے ہیں ان کا مکالمہ ایسا ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ معلوم ہوتا

ہے کہ دو آدمی کھڑے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں غرض ان کے ناول انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

نتیجہ

مولانا نذیر احمد کے ناول دلچسپی کو بخوبی جذب کر لیتے ہیں اور قاری کو برابر اپنی طرف متوجہ رکھتے ہیں۔ انکے ناولوں کا موضوع انسان ہے جو ہم کو روزانہ ملتے ہیں اور ہم سے بات چیت کرتے ہیں ان کے قصے گو کہ فرضی ہیں مگر صداقت کا پہلو لئے ہوئے ہیں ڈرامائی پیشکشی انکے یہاں بہت کافی ہے۔ مولانا کے ناول سادہ اور عام فہم ہیں الفاظ اور معنی میں کسی حد تک لچک موجود ہے یہ وہ باتیں ہیں جو آج کل ایک ناول کے جانچنے کا معیار ہیں ان تمام باتوں کو دیکھ کر ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ناول نگار تھے۔ آپ نے ایک ناول نگار کے فرائض کو بخوبی انجام دیا ہے یعنی مواد کی تلاش۔ مشاہدہ۔ انتخاب کے علاوہ وہ اور بھی دوسرے فرائض کے ادا کرنے میں مولانا کامل ہیں اب ہم کو یہ بات طے کرنا باقی ہے۔ کہ سب سے پہلا ناول نگار اردو ادب میں کون گذرا ہے یعنی یہ کہ پہلے مولوی نذیر احمد کے ناول طبع ہوئے یا پنڈت رتن ناتھ سرشار کے۔ اِسکا فیصلہ ان کے ناولوں کی تصنیف و طبع ہونے کی تاریخوں پر چھوڑا جاتا ہے۔

سید غلام محی الدین تحریر کرتے ہیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اردو زبان میں ناول کے طرز صنف ادب کو روشناس کرایا اور بعد میں نذیر احمد نے بھی اس قسم کی کوششیں کیں۔"

"اردو کے اسالیب بیان"

اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے مولانا سے پہلے ناول لکھنا شروع کر دئے تھے اور وہ طبع ہو کر پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے۔ محمد یحیی صاحب تنہا کی ذیل کی تحریر بتلاتی ہے کہ سرشار نے "فسانہ آزاد" کب لکھا جو ان کا سب سے پہلا ناول ہے۔

"غالباً سرشار پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی اڈیٹری اختیار کر کے اپنا دلچسپ اور مشہور "فسانہ آزاد" اخبار مذکور میں شائع کرنا شروع کیا۔"

"سیر المصنفین"

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا سب سے پہلا ناول "فسانہ آزاد"

ہے اس سے پہلے ان کا کوئی ناول طبع نہیں ہوا اور ان کے جو بقیہ ناول ہیں وہ "فسانہ آزاد" کے بعد لکھے گئے ہیں۔

محمد یحییٰ صاحب تنہا "سیر المصنفین"[1] میں اس فسانہ کی تاریخ کے لئے یوں تحریر کرتے ہیں۔

"یہ فسانہ اودھ اخبار کے ضمیمہ کے طور پر دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک برابر شایع ہوتا رہا بعد ازیں ۱۸۸۰ء میں کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا۔"

اس کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے حیدرآباد کے سفر کا حال ۱۸۹۹ء میں لکھا تھا وہ اس کو یوں شروع کرتے ہیں۔

"چار برس کا زمانہ ہوا کہ میں کانگریس کا ممبر ہو کر مدراس گیا تھا وہاں سے بخت رسا حیدرآباد دکن لایا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا سفر ۱۸۹۵ء کے کسی ماہ میں ہوا ہوگا۔ انھوں نے حیدرآباد جانے سے قبل "خُشو کرم دھم" اور "طوفان بے تمیزی" وغیرہ وغیرہ نہیں لکھے۔ "سیر کہسار" "کامنی" اور "جام سرشار" وغیرہ ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۵ء ہی کے درمیان میں شایع ہوئے تھے کیونکہ سرشار نے نظام حیدرآباد دکن جو نذر

---

[1] سیر المصنفین

پہلی بار پیش کی تھی اور اس میں جو کتابیں تھیں۔ ان میں ان کا ناول "سیر کہسار" بھی تھا غرض "سرشار کا پہلا ناول طبع ہو کر ۱۸۸۰ء میں پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔

مگر مولانا نذیر احمد کی کتب کے طبع ہونے کی تاریخوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرشار سے بہت پہلے تصنیف اور طبع ہو چکی تھیں۔

ہم کو مولانا نذیر کے ناول "مراۃ العروس" کی تاریخ اس سے ملتی ہے جو جامع 'حیات النذیر' لکھتے ہیں۔

"اس کتاب "بنات النعش" کو "مرأۃ العروس" کا حصہ دوم کا کہنا بجا ہے۔ "مراۃ العروس" کے شائع ہونے کے تیسرے برس ۱۸۷۲ء میں یہ کتاب بھی گورنمنٹ میں پیش کی گئی۔"

اس تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 'مراۃ العروس' جو آپ کا سب سے پہلا ناول ہے ۱۸۶۹ء میں طبع ہوا تھا۔

اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "بنات النعش" ۱۸۷۲ء میں تصنیف ہو چکی تھی۔ جناب ڈائرکٹر صاحب نے کتاب مذکور پر ریمارک لکھتے ہوئے حکم دیا تھا۔

"............ مصنف اس کتاب کی تصحیح کر دے اور جو مقام اوپر بتلائے گئے ہیں اُن کو رفع کر دے تو یہ کتاب سررشتۂ تعلیمات اور عام لوگوں کے لئے طبع کی جائے۔"

۵ر فروری ۱۸۷۲ء

ہم کو اس کتاب کے طبع ہونے کی صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیں جو کچھ اس کے متعلق معلوم ہو سکا درج ہے۔

"جامع حیات النذیر" "توبۃ النصوح" کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"یہ کتاب اعظم گڑھ کی تصنیف ہے.....

..... مولانا نے وہاں ایک تو "توبۃ النصوح" لکھی جو اُن کے ناولوں میں سب سے زیادہ مقبول ناول ہے۔"

یہ ٹھیک معلوم ہے کہ مولانا جب حیدرآباد اعظم گڑھ سے گئے تو پہلے وہ دہلی آئے اور پھر حیدرآباد گئے آپ کی حیدرآباد کی روانگی کے متعلق سید افتخار

حیات النذیر میں یوں رقم طراز ہیں۔

"بہر حال ان سب باتوں کا نتیجہ:
کہ مولانا یکم اپریل ۱۸۷۷ء کو اعظم گڈھ
فرلو لے کر دہلی روانہ ہوئے اور وہاں سے اور
اور مقامات پر ہوتے ہوئے ۲۲ اپریل کو
حیدرآباد فرخندہ بنیاد پہنچ کر نواب محسن الملک
بہادر کی کوٹھی میں فروکش ہوئے"

جیسا کہ اوپر لکھا ہے کہ "توبۃ النصوح" آپ
کی اعظم گڈھ کی تصنیف ہے اور وہ ۱۸۷۷ء میں اعظم گڈھ سے
چلے گئے تھے اس لئے "توبۃ النصوح" ضرور ۱۸۷۷ء
سے پہلے طبع ہو چکی ہو گی

"محصنات" کے متعلق مولف حیات النذیر تحریر
کرتے ہیں۔

"اس ناول میں تعدد ازواج کے خراب
نتیجوں کو ایک دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں دکھلایا
گیا ہے .... جو ۱۸۸۵ء میں شائع
ہوئی"

اس کے علاوہ آپ کا ناول "ابن الوقت" اسی سال
کرد۔ ہوا تھا اور ان کے بقیہ ناول بعد میں طبع
کو ر ز ہے۔

عام، تمام تاریخوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم بلا تامل
کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب میں ناول نگاری
موجد اور سب سے پہلے ناول نگار مولوی نذیر احمد ہی
تھے۔



د ر ،

طبعت فی مطبع الاسرار کریمی حسین گنج الہ آباد